دیوان داجہ تربیزخ

صدر آل انڈیا تعلیمی سنگ

کانفرنس

ریڈر

28 نمبر 1929

DR. Prof R.N.K Bamzai
Prof of Genetics JNU
Now V.C. Vaishno Devi University Jmu

رام سر

Rani Iqbal Till

P — 56

جلد: ۴۶ شمارہ: ۱

نِگراں:

ظفر اقبال منہاس

مُدیر:

محمد اشرف ٹاک

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگو یجز

ناشر : سیکریٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز۔

کمپوزنگ: بشارت احمد بابا

مطبع: جے، کے، آفیسٹ پرنٹرس۔نئی دہلی

تصاویر: غلام محی الدین

شیرازہ میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں اُن میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈیمی یا ادارے کا کُلاً یا جزواً اتفاق ضروری نہیں۔

سرورق: بشیر احمد

☆......خط و کتابت کا پتہ:

محمد اشرف ٹاک

ایڈیٹر "شیرازہ" اردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

سرینگر / جموں

فہرست

افسانے

تبصرۂ کتب

ضمیمہ

..................☆☆☆..................

حرفِ آغاز

برِصغیر میں کشمیر ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں کم وبیش اَڑھائی ہزار سال کی تحریری اور تواریخی روایات موجود ہیں۔ یہاں تب بھی تواریخیں لکھی جاتی تھیں جب کہ دُنیا کی بہت سی مہذب قوموں میں اِس کا تصور بھی نہ تھا۔ یہ روایات اگر چہ وقت کے ساتھ ساتھ پنپتی گئیں لیکن بڑے عرصے سے یہ ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ خطے کی ایک ایسی جامع تاریخ کا لکھنا باقی ہے جس میں تمام تر ماخذوں تک رَسائی حاصل کر کے ہمارے تہذیبی سفر کی نشاندہی کی جا سکے اور جو اِنسانی زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہو۔ اِس کارِ عظیم کا بیڑا ہمارے مقتدر مورّخ اور کشمیر شناس پرتھوی ناتھ کول بامزئی نے اُٹھایا جنہیں عام طور پی، این کے بامزئی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اُنہوں نے بین الاقوامی معیار زیرِ نظر رکھ کر بیسوی صدی کی چھٹی دَہائی میں ''دی ہسٹری آف کشمیر'' اور ''پولیٹکل اینڈ کلچرل ہسٹری آف کشمیر'' تصنیف کر کے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا جس کی تعریف وتوصیف ملک کے اوّلین وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی کی۔ اَفسوس

کہ بڑے بڑے اَذہاں کو متحرک کرنے والا عظیم فرزندِ کشمیر اِس جہانِ فانی سے ایسے رخصت ہوگیا کہ اُس کے قدردانوں کو ایک عرصے تک کانوں کان خبر نہ ہوسکی۔ یقیناً اِس کی وجہ یہ ہے کہ موصوف کبھی جاہ ونمود اور شور شرابے کے پیچھے نہیں بھاگے بلکہ تمام عمر نہایت ہی خاموشی سے علمی اور تحقیقی کاموں میں منہمک رہے۔ اُنہوں نے کشمیر کی تاریخ اور ثقافتی متاع کے بارے میں درجن بھر تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جن کی کشمیر سے زیادہ کشمیر سے باہر بلکہ بین الاقوامی سطح پر دُھوم ہے اور اُنکی رائے کو مستند سمجھا جاتا ہے۔

پی این کے بامزئی کو عقیدت کا خرج پیش کرنے کے لئے زیرِ نظر اشاعت میں کئی مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ اِن میں پی، این کے بامزئی کا اپنے والد بزرگوار پنڈت آنند کول بامزئی پر تحریر ایک مضمون کے ساتھ ساتھ خود اُن کا ہی ایک انگریزی مقالہ بھی شامل ہے جو امانت کے تقاضوں کے زیرِ نظر انگریزی ہی میں ہی بطور ضمیمہ من وعن پیش خدمت ہے۔

اُمید ہے ہماری اِس کوشش کی خاطر خواہ پذیرائی کی جائے گی۔

● —— محمد اشرف ٹاک

..................☆☆☆..................

محمد یوسف ٹینگ

پی این کے بامزئی

ایک قدرِ اوّل کے کشمیر شناس کا انتقال

میں فرصت کے چند لمحوں میں کچھ پرانے اخبارات دیکھ رہا تھا کہ ایک بے قاعدگی کے شائع ہونے والے پرچے کے تعزیتی کالم پر بھی نظر پڑی۔ اس میں درجن بھر افراد کے گذرنے کے ساتھ ہی پی۔ این۔ کول بامزئی کے سرگباش ہونے کی خبر بھی تھی۔ انکی وفات اگست ۲۰۰۷ء میں نئی دلی کے کیلاش اپارٹمنٹس میں ہوئی تھی۔ جہاں وہ تیس پنتیس سال سے ٹھہرے ہوئے تھے۔ مجھے یہ خبر پڑھ کر بڑا صدمہ ہوا کہ وہ میرے اچھے دوست تھے اور ہم ایک دوسرے کے ساتھ گھر آنے جانے کا ربط بھی رکھتے تھے لیکن اس سے بڑا صدمہ اس خیال سے ہوا کہ اتنے اہم مورّخ اور کشمیر شناس کے انتقال کی خبر نہ کسی بڑے اخبار میں آئی اور نہ میں نے برقیاتی نشری اداروں سے سنی جن کو میں باقاعدگی سے سنتا رہتا ہوں۔ ہمارے یہاں اگر کسی چھوٹے سے ادیب یا ثقافتی کارکن کی وفات ہوجاتی ہے تو ہمارے پرائیویٹ اور سرکاری ادارے اس سلسلے میں بڑی بڑی تقریبات کرتے رہتے ہیں اور مرحوم کو خاص طور صوفی خیال سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن بامزئی صاحب کے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۸۸ء میں

جب میں کلچرل اکادمی کا سیکرٹری تھا تو اکادمی نے Meet the Eminent Contemporaries سلسلے میں ان کے اعزاز میں براڈوے ہوٹل سرینگر میں ایک ملاقات کا اہتمام کیا تھا۔ اس میں سرینگر کے اچھے خاصے تواریخ دان، ادیب اور دانشور شریک ہوئے تھے۔ محفل میں بامزئی صاحب سے سوالات کئے گئے جنکا انہوں نے عالمانہ جواب دیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ بامزئی صاحب کا شاید آخری عوامی دربار Public Appearance تھا اور اس کے بعد کے حالات نے اُنکا کشمیر سے تعلق ضعیف بنادیا۔

پرتھوی ناتھ کول بامزئی سرینگر میں زینہ کدل کے پاس جہلم کے بائیں کنارے پر ایک بہت بڑے مکان میں پیدا ہوئے۔ یہ گورگاڑی محلے کا حصہ ہے جو وہ فروخت کر چکے تھے۔ مگر اب بھی اس کا ڈھانچہ موجود ہے۔ وہ پنڈت آنند کول بامزئی کے بیٹے تھے۔ پنڈت آنند کول اپنے وقت کے رئیسوں میں شمار ہوتے تھے اور وہ بیسویں صدی کی کروٹ پر سرینگر کی میونسپل کمیٹی کے صدر رہ چکے تھے۔ آنند کول پہلے کشمیری تھے جنہوں نے اُنیسویں صدی کے آخر میں انگریزی زبان میں لکھنے پڑھنے کا ملکہ پیدا کیا۔ انہوں نے کشمیریات پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ جن میں کشمیری پنڈتوں، لل عارفہ، شیخ العالمؒ کے متعلق اور کشمیر کے آثار قدیمہ پر کتابیں شامل ہیں۔ وہ کلکتہ کے نامی انگریزی میگزین "دی ماڈرن ریویو" میں بھی برابر لکھتے رہتے تھے اور حق یہ ہے کہ کشمیر کے آثار اور اُدب کے بارے میں انہوں نے کشمیر سے باہر کی دنیا کو پہلی بار روشناسی کرائی۔ ان کے مکان جسکی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے، میں ۱۹۱۵ء میں رابندر ناتھ ٹیگور کی مہمان نوازی کی گئی۔ چونکہ یہ مکان وِتستا کے کنارے پر ہے اس لئے ٹیگور کشتی کے

ذریعے ہی وہاں پہنچے جہاں انکا کشمیری روایات کے مطابق شاندار سواگت کیا گیا۔ محلّہ کی پنڈتانیوں نے انکی آرتی بھی اتاری۔ کشمیر میں صرف پنڈت آنند کول ہی واحِد شخصیت تھے جن کے گھر کو مہاریشی نے اپنے قدموں سے سرفراز کردیا۔ پرتھوی ناتھ کول بامزئی ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے اور ۲۰۰۷ء میں انتقال کرنے کے وقت ان کی عمر ۹۷ سال سے زیادہ تھی۔ پنڈت آنند کول کا انتقال ۱۹۴۱ء میں ہوا لیکن انہوں نے پرتھوی ناتھ کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ چنانچہ پرتھوی ناتھ انگریزی کے بہت اچھے لیکھک بھی تھے۔ پولیٹکل سائنس پر بھی نظر رکھتے تھے اور کشمیر کی تہذیب وتواریخ سے بھی بیحد شغف رکھتے تھے۔ انہوں نے ریاستی انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں اپنی ملازمت شروع کی اور ساتھ ساتھ اپنے لکھنے پڑھنے کا شوق بھی پورا کرتے رہے۔ ۱۹۵۳ء میں وزیرِاعظم شیخ محمد عبداللہ کی برطرفی اور گرفتاری سے بہت پہلے دہلی کے حکمران اور ان کے مقامی کاردار اُن کی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کے معمولات، دَوروں، گفتگو اور تقریروں کو باقاعدگی سے رپورٹ کیا جاتا تھا۔ مجھے خود پی این کے نے کہا ہے کہ ان دنوں ڈی پی در صاحب ڈپٹی ہوم منسٹر تھے لیکن حکومت کے بہت اہم کارفرما اور دہلی کے رازدار۔ انہوں نے پی این کے کو بُلا کر اور اعتماد میں لے کر کہا کہ تم شیخ صاحب کی عوامی تقریبات اور دوروں میں ان کے ساتھ رہتے ہو۔ اصل اطلاعات چپکے چپکے مجھے لکھ کے دینا۔ ظاہر ہے کہ ۱۹۵۳ء کے نرغے کے بعد بامزئی صاحب کی خدمات نے اپنا کرشمہ دکھایا اور انہیں مرکزی حکومت میں اہم عہدے دیئے گئے۔ بامزئی صاحب نے ان مواقع کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی علمی سرگرمیوں کو چمکایا۔ ان کی معرکتہ الآرا

کتاب A History of Kashmir ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی۔ اگر چہ اس کے بعد بھی کشمیر کی تواریخ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اس کتاب کا خاص امتیاز اب تک موجود ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کشمیر کی تاریخ کی ابتداء سے بیسویں صدی کے وسط تک کشمیر کے تواریخی واقعات اس طرح سے کسی اور کتاب کے دو covers کے اندر ایک جا نہیں ملتے۔ ایسا اس سے پہلے کشمیر کی پہلی اردو تواریخ گُلدستہ کشمیر از ہرگوپال خستہ (۱۸۸۲ء) میں ہوا تھا لیکن ایک تو وہ کتاب مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے تک ہی پہنچی ہے۔ دوسرے اسکی سطح اور علمی مرتبہ بھی بہت کم ہے۔ پی این کے بامزئی کی تاریخ اس علم کے جدید تر تقاضوں کا خیال کر کے لکھی گئی ہے اور میرے حقیر خیال میں اپنی نوعیت کی سب سے اچھی اور معتبر کتاب ہونے کے علاوہ بہت کارآمد اور بھرپور بھی ہے۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ بامزئی صاحب خود لکھتے ہیں کہ انہیں اس سلسلے میں محکمہ آرکائیوز اور دوسرے صیغہ راز کاغذات کا مطالعہ کرنے کی اجازت اس وقت کے ڈائریکٹر جنرل انفارمیشن پنڈت جانکی ناتھ زتشی نے دلائی جو پہلے شیخ محمد عبداللہ اور بعد میں بخشی غلام محمد کے انتہائی قریبی معتمد تھے۔ اس طرح سے اس کتاب میں پہلی بار ہمیں سرکاری دستاویزات سے حاصل کیا ہوا مواد ملتا ہے۔ کیونکہ ان سے پہلے یہ شرف کسی کو حاصل ہوا ہی نہیں تھا۔ یہ بات تسلیم کی جانی چاہئے کہ انہوں نے اس رعایت کا زبردست فائدہ اٹھایا۔ ان کے بعد بھی اگر چہ ڈاکٹر کرن سنگھ کے علاوہ معدودے چند اور افراد کو اجازت ملی لیکن وہ بامزئی کی لگن کا جواب پیدا نہیں کر سکے ہیں۔

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

بامزئی نے اس کتاب کو بجا طور پر اپنے نامور والد پنڈت آنند کول کو منسوب کرتے ہوئے لکھا۔

''میرے پتا شری پنڈت آنند کول کی یاد میں، جنہوں نے مجھے کشمیر اوراس کی تہذیبی وراثت سے روشناس کردیا۔''

بامزیئے کی اس کتاب کی ایک خصوصیت ہے کہ اسکا پیش لفظ اُس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہرلال نہرو نے لکھا ہے۔ اگر چہ جواہرلال نہرو نے اس سے قبل بھی کلہن کی راج ترنگنی کے انگریزی ترجمے کا پیش لفظ لکھا تھا لیکن اُس کی بات دوسری تھی۔ ایک تو یہ کہ وہ ترجمہ ان کے برادرِ نسبتی رنجیت سنگھ پنڈت نے کیا تھا اوراس میں رشتہ داری کا لحاظ موجود تھا (رنجیت پنڈت جواہرلال کی بڑی بہن وجے لکشمی پنڈت کے خاوند تھے)۔ دوسری بات یہ کہ اُس وقت جواہرلال نہرو ایک سرکردہ سیاستدان تو تھے لیکن ملک کے بااختیار وزیر اعظم نہیں۔ بامزئی نے کیسے کمند لگا کر انہیں اپنی کتاب کے صفحات میں خرامِ ناز پر آمادہ کیا وہ واقعی قابلِ تحسین ہے۔ اپنی عادت کے مطابق جواہرلال نے اس چھوٹی سی تحریر میں کئی قابل توجہ باتیں لکھی ہیں۔

☆...... کشمیر کی تواریخ میں عورتوں نے بڑا اہم رول کیا ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے دوسرے حصوں کی بہ نسبت انہیں کشمیر میں زیادہ حقوق حاصل تھے۔

☆...... کشمیر قدرتی خوبصورتی سے مالا مال ہے اوراس شاندار جگہ کا باشندہ ہونے میں ایک فخر کا احساس ہوتا ہے۔

☆...... تقسیم ہند کے بعد کشمیر میں کوئی بڑا افرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔

☆......گذشتہ کئی برسوں سے کشمیر خبروں میں نمایاں ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ جیسے یہ صرف زمین کا ایک ٹکڑا ہے جس کے بارے میں کشمکش ہے اور اِس بارے میں اقوامِ متحدہ کی سیکورٹی کونسل میں طول طویل مباحثے ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اِس بحث وجدل کے پیچھے کشمیر کے عوام ہیں جو اپنی زندگیاں اپنے طور جینا چاہتے ہیں۔ اب انہوں نے ترقی کرنے کی آزادی کا ذائقہ چکھا ہے۔

☆......کلہن کی راج ترنگنی سنسکرت کی اکلوتی کتاب ہے جسے تاریخی کہا جاسکتا ہے۔ اس تحریر کے نیچے آٹھ اکتوبر ۱۹۶۲ء کی تاریخ درج ہے۔

پرتھوی ناتھ کول بامزئی شکل وصورت کے اعتبار سے بہت وجیہہ تھے۔ لمبا دھڑنگا قد، ستواں اور مضبوط بازو اور چوڑا سینہ۔ بامزئی پٹھانوں کی ذات ہے اور کشمیر میں کسی مسلمان بامزئی کا مجھے کوئی پتہ نہیں چلا۔ لیکن بامزئی صاحب کو دیکھ کر پٹھانوں کا قد وقامت اور کاٹھی ضرور یاد آتی تھی۔ ان کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ کھلی رہتی اور وہ بہت تمکین، اطمینان اور آہستگی سے بات کرتے تھے۔ میں نے نہ انہیں کبھی غصہ کرتے دیکھا نہ لہجہ بلند کرتے ہوئے۔ اگرچہ ان کی کتابوں کی ہندوستان اور اس سے باہر دھوم تھی۔ لیکن کشمیر میں کچھ تو ان کے باہر رہنے کی وجہ سے اور کچھ ذاتی چشمک کی وجہ سے کم چرچا رہتا تھا جسکا انہیں قلق تھا۔ لیکن میں نے جب کشمیر سے متعلق ان کی ایک درجن کتابیں دیکھیں اور ان میں خاص طور کشمیر کی زبان اور اس کی خاص ثقافتی متاع کے بارے میں کچھ اوریجنل خیالات دیکھے تو مجھے لگا کہ اُن کو نظر انداز کر کے کلچرل اکادمی خود اپنی تہذیبی حس کے ناکارہ ہونے اور اپنے واجب کام سے غفلت شعاری کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ چنانچہ انہیں اکادمی کا خلعتِ فاخرہ پیش کیا گیا۔ مجھے اس دن ان کی

مسکراتی آنکھوں میں تشکر کے آنسو بہتے ہوئے نظر آئے۔ سچ ہے کہ ہر انسان اپنوں کے تسلیم کئے جانے پر ہی اپنے کارنامے کی لذت محسوس کرتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی کتابوں میں کشمیر کے بڑے اور مشترکہ تہذیبی دھارے کا جو باخبر عرفان ملتا ہے اس کی نظیر ہمارے دوسرے تواریخ نویسوں کے یہاں کم کم ہی نظر آتی ہے۔ ان کے پاس کشمیر کے تہذیبی نوادر اور شاہکاروں کا ایک بڑا ذخیرہ تھا۔ میں نئی دلی میں لالہ لاجپت روڑ پر اُن کے ۱۳۔ کیلاش اپارٹمنٹ میں گیا ہوں جہاں وہ مجھے بڑے لطف اور فخر کے ساتھ یہ نوادرات دکھاتے تھے۔

دراصل ان کے والد انیسویں صدی سے ہی ان چیزوں کی اہمیت جان گئے تھے۔ آنند کول نے کشمیری لوک ورثے کے ایک اہم مورّخ جان ہنٹن نولز کے ساتھ کام کیا تھا۔ اسلئے جب کشمیری ان جواہر و گواہر کی اہمیت و عظمت سے بے خبر تھے۔ آنند کول کے سامنے کشمیری محاورے کے مطابق 'مونگہ ڈل' کھلا ہوا تھا۔ ادھر آنند کول اچھے خاصے گذارے والے تھے۔ ان دنوں ان چیزوں کی قیمت بھی کیا رہی ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے کشمیری اور فارسی مخطوطات کا ایک بڑا ذخیرہ اکٹھا کیا تھا۔ اسکے علاوہ مورتیاں، قلمی تصاویر، قدیم سکے اور دوسرے artefacts بھی۔ اس میں تواریخِ حسن کا ایک قلمی نسخہ بھی تھا جو حسن کھویہامی کے گزرنے کے ساتھ ساتھ تحریر ہوا ہے۔ جو رہی سہی کسر تھی وہ پی این کے نے پوری کی تھی۔ بہر حال جب میں نے ان کشمیری عجائبات کو نئی دلی میں دیکھا تو میرے مُنہ میں پانی بھر آیا کہ انہیں اپنی مٹی میں واپس لیجاؤں جہاں کی فضاؤں نے انہیں سدھارا تھا۔ لیکن بامزئی صاحب نے ان کی قیمت ایسی لگا رکھی تھی کہ اس وقت کی کلچرل اکادمی کا سارا بجٹ اس کی کفالت نہ کرسکتا۔ چنانچہ میں نے

اس معاملے میں صدر اکادمی شیخ محمد عبداللہ کو engage کرنے کا منصوبہ باندھا۔ شیخ صاحب بامزئی کا نام سن کر تیوری چڑھانے لگے تو مجھے احساس ہوا کہ دہلی میں ان کے رول کے بارے میں شیخ صاحب بے خبر نہیں ہیں۔ لیکن میں نے کشمیریات کے حوالے سے بامزئی نوادرات کا ایسا تانتا باندھا کہ شیخ صاحب پگھل گئے۔ انہوں نے کہا اسے اپنی چیزوں کے ساتھ آنے کیلئے کہہ دو اور تاریخ بھی مقرر کی۔ میں نے بامزئی کو اطلاع دی تو انہیں پہلے یقین ہی نہیں آیا۔ بہر حال جب بہت سی چیزیں، جو ذرا ہلکی پھلکی تھیں لائیں تو ہم شیخ صاحب کی مولانا آزاد والی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ شیخ صاحب اپنے لان میں بیٹھے تھے۔ انکے مزاج بہت بشاش تھے۔ جب بامزئی نے سلام کیا تو شیخ صاحب نے اپنے ذہنی تحفظات کے باوجود انکو کھڑے ہو کر گلے لگالیا۔ دونوں دراز قامت تھے تو لگ رہا تھا کہ کشمیری سفیدے کے درخت ایک دوسرے کی بانہوں میں باہیں ڈال رہے ہیں۔ شیخ صاحب نے پچھلی یادوں کا ذکر کیا۔ وہ ان کے والد سے خوب واقف تھے۔ ان سے پوچھنے لگے کہ آپ لوگوں نے یہاں مکان بیچ کر دلی میں جائیداد خریدی ہے۔ آپ اس طرح کشمیر کو چھوڑ دو گے تو پھر اس کی تاریخ و تہذیب کی آرائش زیبائش کون کرے گا۔ بامزئی صاحب اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے اور کچھ جھینپ سے گئے۔ کہنے لگے کہ اب بچوں کا روزگار وہیں ہے۔ کیا کریں؟ شیخ صاحب نے انکی دوسری جائدادوں کے متعلق دریافت کیا تو بامزئی صاحب کچھ ندامت سے آنکھیں نیچی کر کے کہنے لگے کہ سب بیچا جا چکا ہے۔ شیخ صاحب نے ایک تبسمِ عارفانہ کے ساتھ کہا اور اب نئی دہلی میں کشمیر کی تاریخ اور تہذیب کو بیچ کر پھل پھول رہے ہو۔ بامزئی کے پسینے چھوٹ رہے

تھے۔ میں نے انکا یہ ماجرا دیکھا تو ماحول کی ناگواری دور کرنے کیلئے بامزئی صاحب کے تھیلے کا فیتہ کھولا۔ اس میں سب سے پہلے ملکہ نور جہاں کی تصویر نکلی۔ ایک مغل تصویر چہ (Miniature) حسنِ اتفاق سے اس میں نور جہاں کو آبِ گل میں نہاتے دکھایا گیا تھا۔ شاید کسی ایسی ہی خوبصورت ساعت میں نور جہاں نے عطرِ گلاب کا راز پا کر اِس کو تیار کیا تھا۔ شیخ صاحب زاہدِ مرتاض تھے لیکن ایسے نظاروں کے معاملے میں غضِ بصر (نگاہ نیچی کرنا) کے پابند نہیں تھے۔ تصویر ہاتھ میں لی اور کہا کہ اِس کو دیکھ کر سمجھ میں آیا کہ جہانگیر اس قدر زن مرید کیوں بن گیا تھا مگر تصویر بنانے والے نے بھی کمال کیا ہے۔ بہرحال شیخ صاحب فن پارے دیکھتے رہے اور عش عش کرتے رہے۔ اچانک بامزئی سے سوال کیا ''کیا جواہر لال یا اندرا گاندھی نے بھی ان کو دیکھا ہے''۔ بامزئی صاحب سکتے میں آگئے۔ لیکن کہا کہ جناب ان کو کیوں دِکھاتا؟ شیخ صاحب نے قہقہہ لگایا اور کہا وہ ان چیزوں کو دیکھ کر بہت لطف اندوز ہوتے...... باتیں جاری رہیں۔ چائے بھی پہنچی۔ لیکن شیخ صاحب نوادرات کو بار بار دیکھتے بھالتے رہے۔ وہ مجھ سے بولے ''یہ لوگ جوہر فروش ہیں اور نہ معلوم کیا قیمت لگائیں گے۔ اب تم ان سے معاملہ طے کر کے مجھے بتانا۔ ہم پیسے کیلئے کوئی سبیل دیکھیں گے''۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ یہ سو دانا شُدنی ہے اور اس میں میں خواہ مخواہ مارا جاؤں گا۔ میں نے کہا ''جناب! یہ ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔ کم از کم دو آدمیوں کو میرے ساتھ اور شامل کیجئے''...... شیخ صاحب نے کہا ''ہاں تم بڑے بزدل ہو۔ کسی بڑے سودے کی توقع کرنا تم سے بے کار ہے'' اور انہوں نے دو اور اصحاب کے نام تجویز کئے۔ جن میں بامزئیے صاحب کا سابقہ پڑوسی ایک بیوپاری تھا اور ایک سرکاری

افسر...... یہ بات چیت مہینوں چلتی رہی لیکن بامزئی صاحب کوئی قابلِ لحاظ رعایت کرنے کی کوئی رغبت نہیں دکھاتے تھے۔ پھر میرے ساتھی حضرات کے ان کے ساتھ اپنے بھی حساب تھے۔ انہوں نے بھی بیل کو منڈھے چڑھنے نہیں دیا اور یہ کشمیری نوادرات ہماری پہنچ سے باہر چلی گئیں۔

بامزئی صاحب نے ۱۹۲۶ء کے اوائل میں مہاراجہ ہری سنگھ کی تخت نشینی کا جشن بھی دیکھا تھا کیونکہ سرکار کے بہت قریب ہونے کے باعث ان کے والد آنند کول صاحب کو شاہی دعوت پر جموں بلایا گیا تھا۔ مجھے بامزئی صاحب نے کہا کہ والد نے مجھے ساتھ لیا اور ہم اسی کوٹھی میں ٹھہرائے گئے جو ریذیڈنسی روڈ کے آخری کونے پر واقع ہے اور اب وزیر اعلیٰ کی رہائش گاہ میں تبدیل کردی گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس کوٹھی میں کوئی انگریز افسر رہتا تھا لیکن ان دنوں جموں میں اچھی رہائش گاہوں کی قلت تھی اس لئے اسے مہمان خانے میں تبدیل کردیا گیا۔ بامزئی صاحب نے بتایا کہ ان دنوں سرینگر کے بہترین آشپازوں اور پنڈت باورچیوں کو جموں بلایا گیا تھا اور وہ بہترین کشمیری ضیافتیں تیار کرتے تھے۔ سارے ہندوستان سے راجے، مہاراجے، ان کے شہزادے، رانیاں، رئیس وغیرہ جموں میں آئے ہوئے تھے۔ ہماری کوٹھی سے ذرا باہر کا مکان بینڈ ماسٹر کی رہائش گاہ کہلاتا تھا۔ (یہ بعد میں مرزا محمد افضل بیگ وغیرہ کی کوٹھی بنی) وہاں دن رات ریاست میں آئے ہوئے نئے نئے انگریز بینڈ کی دُھنیں بجتی رہتی تھیں۔ وہاں کشمیر کے بھانڈ اور دوسرے موسیقار اور ڈوگری اور پنجابی ساز بجانے والے اور گائیک بھی ڈیرہ لگائے ہوئے تھے اور میں دِن بھر ان کے گیت سنتا اور جھومتا رہتا تھا۔ بامزئی صاحب نے کہا کہ ان دنوں وہاں کشمیر کی حافظاؤں بلکہ لاہور وغیرہ کی

VOLUME 1
CULTURE AND
POLITICAL HISTORY
OF
Kashmir
P.N.K. BAMZAI

P. N. K. Bamzai

C-13, Kailash Apartments,
Lala Lajpat Rai Road
New Delhi-110048

June 23, 1988

My dear Taing Sahib,

I am grateful to you for yur letter of 11th instant conveying the news of the Academy's grant of a Role of Honour to me for my services to the cultural life of Kashmir.

This is an honour which gius recognition to what little service I have rendered to Kashmir's cultural heritage and naturally I feel elated. I am beholden to you for having brought my work to the notice of the Academy members.

Your personal interest in m. and my writings is a greater reward because you ae yourself a keen lover of Kashmir and "Kashmiriat" Even a brief sitting with you is a treat--educative, enlightening, and full of sparkling wit and humour.

I can well realize how happy you must have felt at the Award being bestowed on me. That your efforts have succeeded must have given you lot of pleasure too.

Please accept my sincere thanks for all that you have done for me; and for your congratulations on my being given the Award.

I am keenly awaiting the official communication from the Academy.

With regards and respects.

Yours sincerely,

P N K Bamzai

Janab Mohd. Yusuf Taing,
335, Jawahar Nagar,
Srinagar (Kashmir)

ٹینگ صاحب کے نام پی این کے بامزئی کا ایک مکتوب

VOLUME 3
CULTURE AND
POLITICAL HISTORY
OF
Kashmir
P.N.K. BAMZAI
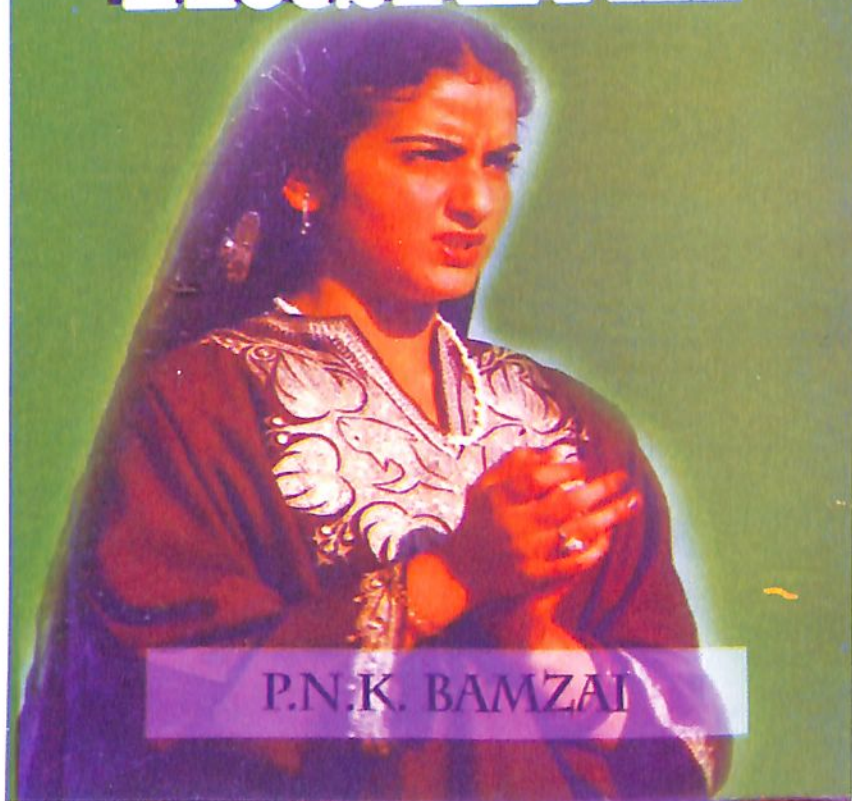
A HISTORY OF KASHMIR

POLITICAL • SOCIAL • CULTURAL

FROM THE EARLIEST TIMES TO THE PRESENT DAY

BY

PRITHIVI NATH KAUL BAMZAI

FOREWORD BY

JAWAHARLAL NEHRU

PRIME MINISTER OF INDIA

METROPOLITAN BOOK CO. PRIVATE DELHI

DELHI

A History of Kashmir

Political – Social – Cultural

From the Earliest Times to the Present Day

CULTURE AND POLITICAL HISTORY OF KASHMIR

Volume 1
Ancient Kashmir
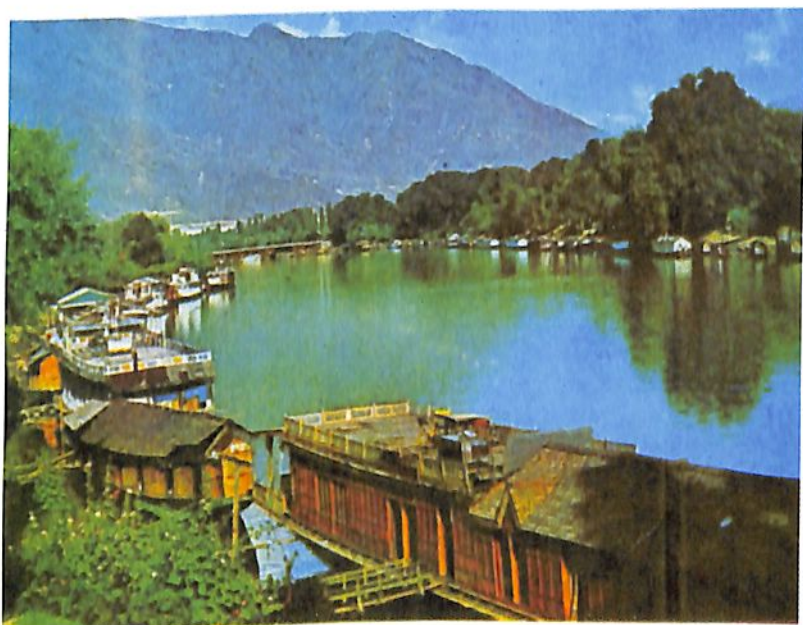
P.N.K. Bamzai

ناچنے والیوں کو بھی لایا گیا تھا۔ لیکن ان کے مُجرے رات میں ہوتے تھے۔ عام طور لڑکوں کو وہاں جانے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن میں کبھی اپنے پتا جی کے ساتھ وہاں پہنچ جاتا۔ یہ نچنیاں کمال کا رقص دکھاتیں اور محفل کو لوٹ پوٹ کرتیں۔ باہر سے آئے ہوئے راجے مہاراجے وہاں کبھی کبھی بیہودگی پر بھی اتر آتے لیکن ناچنے والیاں اسکا بُرا نہیں مناتیں۔ کیونکہ وہ ان پر اشرفیاں اور روپے پھولوں کی طرح نچھاور کرتے رہتے۔ ایک بار تو ایک راجکمار نے ایک ناچنے والی کی بانہہ پکڑ کر اسے لپٹا لیا۔ ناچنے والی گھبرائے شرمائے بغیر ان کی چھیڑ چھاڑ سہتی رہی لیکن جب اس نے ایک دِلربا ٹھمکے ساتھ اپنے آپ کو چھڑا لیا تو اس کے ہاتھ میں راجکمار کے گلے میں پہنی ہوئی سچے موتیوں کی بہت ہی قیمتی مالا تھی۔ راجکمار اُف بھی نہ کر سکا۔ بامزئی کے مطابق مہاراجہ ہری سنگھ کبھی رات گئے اپنے مہمانوں کا حال پوچھنے کیلئے آتا تھا۔ چند ثانئے رقص و سرور بھی دیکھتا رہتا لیکن جوں ہی تال سم کا جادو بولنے لگتا وہ چپکے سے نکل جاتا تھا۔ بامزئی صاحب نے کہا کہ تخت نشینی کے دن گلگت، لداخ، پونیال، پونچھ، پاڈر، کشتواڑ، غرض ریاست کے ہر علاقے سے آئے ہوئے لوگ اپنی خاص ملبوسات میں موجود تھے۔ ہاتھی تھے، اونٹ تھے، گھوڑے تھے، خچر تھے، دمامے اور نقارے۔ شہنائیاں اور نرسنگھے، مُرلیاں اور بگل...... سینکڑوں نازنین ناریاں گھنگھرو باندھ کر چل رہی تھیں...... پرستان کا سا عالم تھا جو اِس کے بعد بس میں نے کبھی کبھی صرف اپنے خوابوں میں ہی دیکھا...... اس سے پہلے کہ میں اس پیراگراف کو ختم کروں۔ میں یہ بات درج کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے بامزئی صاحب کے یہاں اٹلی کے رینائی سانس کی چند تصویریں اور چند مرمر کی مورتیاں دیکھیں۔ وہ کہاں سے آئیں تھی مجھے علم نہیں۔ لیکن بامزیئے خانوادے کے رسوخ،

ان کے رابطوں اور ان کے اپنے شوق کی وجہ سے یہ کشمیر یا دلی میں ممکن ہو گیا ہو گا۔ جس میوزیم اور گیلری میں جائیں گی اس کی شان وشوکت کو بڑھائیں گی۔

بامزئی صاحب ۱۹۸۸ء تک ہر سال گرمی کے چند مہینے سرینگر میں گذارنے کیلئے آتے تھے۔ یہاں وہ نواب بازار پل کے جنوبی طرف شاید کرایئے کے مکان میں رہتے۔ میں ان سے وہاں چلنے کیلئے جاتا اور ہمارا کشمیر کی تہذیب وتاریخ پر تبادلہ خیال رہتا۔ اس میں کشمیر میں چوتھی بدھ کونسل کے تامر پر دفینے کے بارے میں بھی ذکر رہتا تھا۔ مجھے مسرت ہے کہ وہ میرے ہم خیال تھے کہ اس عظیم گنج کا سراغ اس وقت تک عام نہ کرنا چاہئے جب تک حکومت ہند اس بات کی گارنٹی نہ دے کہ اسے ریاست سے باہر منتقل نہ کیا جائیگا۔ میں اس تذکرے کو ان کی اہم ترین کتاب یعنی تاریخ کشمیر...... جو اُب تین الگ جلدوں میں شائع کی گئی ہے کی کچھ دل کو لگتی ہوئی باتوں کی طرف اِشاروں پر مکمل کروں گا۔

بامزئی صاحب نے ۱۸۱۹ء میں افغانوں سے جھگڑا کر کے لاہور جانے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کو کشمیر پر حملے کی ترغیب دلانے کا حال بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے جس کے کچھ جُز کہیں اور انہیں ملے تھے۔ لگتا ہے کہ اس بارے میں خود اُن کے اپنے خاندان کے علاوہ کشمیری پنڈتوں کے دوسرے بڑے خاندانوں کی زبانی روایات پر بھی توجہ دی گئی ہے اور تقریباً بیربل در (بیرہ در) کے اس دورے کے ہر دن کا ماجرا لکھ گیا ہے جس کے بعد پھر کشمیر کی خودمختاری کبھی بحال نہ ہو سکی۔ جس دن رنجیت سنگھ کو کشمیر فتح ہونے کی خبر ملی اس نے لاہور میں تین دن تک چراغاں کا حکم دیا۔ اسی طرح جب ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ میں شاہ اسماعیل کے شہید ہونے کی خبر ملی تو ہری پربت سے توپیں داغ کر اسکا اعلان کیا گیا۔ بامزئی کے

مطابق پنڈت رام چند کاک اپنے انگریز افسروں کی خوشامد اور چاپلوسی سے ترقی کے زینے طے کرتا گیا اور بحیثیتِ وزیر اعظم وہ کشمیر کی آزادی کیلئے کوشش کر رہا تھا تاکہ مہاراجہ کی حکومت قائم رہے۔ بامزئی کے مطابق پچھلے ہزارے کے ارد گرد جب سارے پنجاب اور سرحد میں محمود غزنوی کے حملے ہو رہے تھے تو کشمیر ایک دارالامان تھا اور اسی لئے باہر سے بے شمار ہندو کشمیر میں پناہ لینے کیلئے یہاں آ رہے تھے۔ بامزئی نے لکھا کہ کشمیر میں شیومت کے دو سکول تھے۔ ایک تاریخ کے طلوع یعنی عیسوی صدی کی ابتداء میں جسکا ایک پیرو اشوک کا بیٹا جلوک بھی تھا۔ یہ شنویت واد یعنی Dualistic کا حامی تھا لیکن آٹھویں صدی میں واسو گپتا نے جس شیو تنتر کا پرچار کیا وہ ادویت واد یعنی توحید کا حامی تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اُبھرتی ہوئی مسلمان طاقت جو کشمیر کے ارد گرد ڈیرا ڈال رہی تھی' کے اثر کا نتیجہ ہو۔ اسی طرح اونتی ورمن اصل میں وشنومت کا پیرو تھا لیکن اس نے باہر سے شیومت کا لبادہ پہن لیا تھا۔ لیکن جب وہ آخر میں زتھی یأر میں مرنے کیلئے آیا تو اس نے اپنے ویشنوی ہونے کا اعتراف کرلیا...... بامزئی کے مطابق پشمینہ سے کشمیری ساتویں صدی عیسوی سے پہلے واقف تھے کیونکہ ہیون سانگ اپنے سفر نامے میں اسکا ذکر اس کے چینی نام سے کرتا ہے۔ اسی طرح آفتاب پرستی کشمیر میں کشانوں نے ایرانی اثر کے تحت لائی۔ چنانچہ مارتنڈ کا مندر اسکی موجود شہادت ہے۔ بامزئی کے مطابق کالی داس دراصل کشمیری تھا۔ کیونکہ اس نے اپنی ایک نظم میں زعفران کے پھول کا بیان کرتے ہوئے اس کے گیت گائے ہیں۔ اس کے وقت میں کشمیر میں رہے بغیر ایسا کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔

بامزئی صاحب بڑی پُختہ عمر پا کر چلے گئے۔ افسوس یہ ہے کہ جموں وکشمیر

میں انکی وفات کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا۔ کیونکہ اس تجارتی اور اشتہاری دور میں ایسا کرنے کے لئے کسی پٹھو یا پٹھو ادارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن انہوں نے کشمیر کے آثار افکار اور اسکی تاریخ و تہذیب کے ساتھ محبت کی اور عمر بھر اسکے کمالات کا ذکر کرنے میں مصروف رہے انکی تقریباً ایک درجن سے زیادہ کتابیں ان کی اس خدمت کی گواہ ہیں۔ وہ قینچی اٹھا کر مختلف کتابوں کے تراشے کاٹ کر کتاب تیار کرنے والے مورّخ نہیں تھے۔ انہوں نے شدید محنت اور مطالعے اور پھر گہری سوچ سے کام لے کر اپنا بیانیہ تعمیر کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں جگہ جگہ ان کے اصل ریسرچ اور insights کی چنگاریاں روشن ہیں۔ وہ اِس وقت بھی کشمیر کی تاریخ و تہذیب کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے مورخوں میں سے ایک ہیں۔ آئندہ بھی وہ ہماری تواریخ نویسی کے سلکِ گوہر کا تابدار حصہ بنے رہیں گے۔ کشمیر پر لکھتے ہوئے ان کے نام سے سرسری گذر جانا دُشوار ہے اور اس کے علم و فن کا ادراک حاصل کرنے میں ان کو نظر انداز کرنا بے خبری کی دلیل بنے گا۔ انہیں کشمیری زبان سے خاص لگاؤ تھا اور ہمارے دوسرے معاصر تواریخ نویسوں کے برعکس ان کے یہاں کشمیری زبان و ادب کے بصیرت افروز تذکرے ملتے ہیں۔ ان کی بعض آراء پر جانبداری کا ملمع بھی چڑھا ہوا ہے اور ان کی بعض آراء کو مسترد بھی کیا جا سکتا ہے لیکن ان کا مجموعی کارنامہ انہیں بیسویں صدی کا سب سے بڑا کشمیر شناس مورّخ بناتا ہے۔ میرے لئے یہ ذاتی طور پر ایک علم آموز اور مہربان دوست کی جدائی ہے اور دلی جانے کیلئے میری ایک بڑی کشش ختم ہوگئی ہے لیکن یہی کیا کم ہے کہ مجھے ان کے فیضِ صحبت سے اپنی بہت سی ذہنی گتھیاں سلجھانے میں مدد ملی ہے۔

اوتار کرشن رہبر

مورّخ پی این کے بامزئی۔ایک جائزہ

دورِ حاضر کے نامور مورخین میں پنڈت پرتھوی ناتھ کول بامزئی، جو پی این کے بامزئی کے نام سے زیادہ پہچانے جاتے ہیں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔آپ کئی کتابوں کے مصنّف ہیں جن میں سے تین بہت ہی اہم ہیں۔اِن میں ''ہسٹری آف کشمیر'' ''سنٹرل ایشیا اینڈ کشمیر'' اور ''سوشیو اِکانومِک ہسٹری آف کشمیر'' شامل ہیں اور تینوں کا تعلق کشمیر ہسٹری سے ہے۔یہ تمام کتابیں ایک نیا میدان سر کرنے کی نیت سے تصنیف کی گئیں ہیں جس طرف قبل ازیں بہت کم توجہ دی گئی تھی۔بامزئی صاحب اُس وقت کشمیری مورّخوں میں اُس وقت ممتاز اور نمایاں ہوگئے جب اُنہوں نے ''ہسٹری آف کشمیر'' منظرِ عام پر لائی۔اس کے متعلق جو آراً وقتاً فوقتاً مختلف تاریخ دانوں نے ظاہر کی اُس میں یہ بتایا گیا ہے یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔اِن خیالات کا اظہار پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی کیا جنہوں نے اس کا پیشِ لفظ لکھا ہے۔اِن مشہور اور معروف تاریخ شناسوں ڈاکٹر آر۔ایس۔مجمدار اور رو ملا تھاپر نے بھی شامل ہیں۔بامزئی صاحب کی یہ ہسٹری ۱۹۶۲ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔یہ تاریخ دورِ قدیم سے بیسوی صدی کے وسط تک کشمیر کے سیاسی اور سماجی حالات

کا جائزہ لیتی ہے۔ بامزئی صاحب نے کشمیر کی ہسٹری کو نئے اَنداز سے پیش کیا۔

اگر آج کوئی پوچھتا ہے کہ کلہن نے ابھینو گپت جیسے عظیم فلسفی اور نقاد کا نام کیوں نہیں لیا ہے یا یہ کہ جونراج اور شری ور نے اپنے زمانے کی بعض مقتدر ہستیوں جیسے لل دید اور امیر کبیر میر سید علی ہمدانی کا نام کیوں نہیں لیا جنہوں نے یہاں کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی منظر نامے پر اثرات مرتب کئے، یا یہ کہ راج ترنگنی کے مطالعے سے لوگوں کے بودوباش پر براہ راست کوئی روشنی کیوں نہیں پڑتی تو اُسے ایک دم سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ وہ بادشاہوں کا حال احوال لکھتے تھے، اسلئے جو اُنہیں جائز اور برمحل لگا اُسی کا خلاصہ کیا۔ کشمیر میں فارسی زبان میں جو تواریخیں لکھی گئیں اُن کا حال بھی ایسا ہی ہے۔

پی این کے بامزئی کا تعلق بیسویں صدی سے ہے۔ اُن کا نام صاف ظاہر کرتا ہے کہ وہ اصل میں ''کول'' ہیں۔۔۔ کئی پشتوں سے اُنکا خاندان بہت سے ''کول'' گھرانوں میں بامزئی نام ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ اُنکا خاندان عالی وقار اور متمول رہا ہے البتہ یہ افغان نام اور لقب' ایک پنڈت خاندان سے کیسے جڑ گیا؟۔ کشمیریوں کو یہ لقب اُس وقت سُننے کا مِلا جب افغان دَور (۱۷۵۳ءتا۱۸۱۹ء) میں نورالدّین خان بامزئی اور بلند خان بامزئی کشمیر کے صوبے دار بن گئے۔ کہا جاتا ہے کہ بامزئی صاحب کے پردادا پنڈت بابو رام کول' نورالدّین خان بامزئی کے پیش کار تھے اور اُس وقت وہ بامزئی نام سے فوری طور پہچانے جاتے تھے۔ کہاں نورالدّین خان اور کہاں پنڈت بابو رام کول۔ لوگوں نے دونوں کو بامزئی بنادیا۔ تب سے اُن کے خاندان سے یہ لقب چلتا رہا ہے۔

پنڈت بابو رام کول بامزئی کے بعد اُن کی تین پیڑھیاں یعنی پنڈت ست رام کول بامزئی' پنڈت طوطا رام کول بامزئی اور پنڈت آنند کول بامزئی' آئیں اور اُن کے بعد پنڈت پرتھوی ناتھ کول بامزئی زینہ کدل کے نزدیک گرگڑی محلے میں ۱۹۱۰ء

میں پیدا ہوئے، جب ڈوگرہ مہاراج پرتاپ سنگھ کشمیر کے حکمران تھے۔ اُن کے والد پنڈت آنندکول بامزئی اپنے زمانے کے باوصف منشی تھے۔ وہ بہت ہی مدبر اور ذہین تھے۔ عالم، فاضل اور تمدن کے زبردست دِلدادہ۔ کتنے ہی شوق اور وصف اُن میں جمع ہو گئے تھے۔ کشمیر میں ڈوگرہ راج قائم ہوئے صرف بیس سال گزر گئے تھے۔ جموں وکشمیر ریاست وجود میں آچکی تھی اور مختلف تمدنی اکائیوں کو ایک نئے اِنتظامی ڈھانچے میں پرویا گیا تھا۔ پنڈت آنندکول بامزئی نے وقت کی بدلتی ہوئی نہج کو بھانپ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فارسی رخصت ہو رہی تھی اور اس کی جگہ اردو اور انگریزی لے رہی تھی۔ بات اپنی جگہ ہے کہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں فارسی کی بعض اہم کتابیں معرضِ وجود میں آئیں جن میں حسن شاہ کھویہامی کی تواریخ ''تاریخِ حسن'' ایک بہت بڑا کارنامہ ہے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ ہے کہ فارسی کا رواج کم ہو رہا تھا۔ آنندکول بامزئی کا شمار اُن اوّلین کشمیریوں میں ہوتا ہے جنہوں نے سب سے پہلے مشن سکول میں داخلہ لیا اور انگریزی تعلیم حاصل کی۔ یہ وہ دَور تھا جب بعض کئی یورپی محققوں، مصنفوں اور عالموں کی ایک جماعت یہاں سرگرمِ عمل تھی۔ لیکن اُنہوں نے یہاں کی زبان، اَدب، تمدن اور تواریخ میں بے انتہا دلچسپی دِکھائی اور اس حوالے سے کئی کارنامے انجام دیئے۔ اِن باکمال شخصیتوں میں سر والٹر لارنس، آرل۔ سٹائن، ہنٹن نولز بہلر، سرجارج ابراھیم گریرسن، فیڈرِک ڈرِوٹی آر رسل وڈے شامل ہیں۔ ایک نئی ہوا چلی، ایک نیا شوق اور بصیرت اَفروز ماحول پیدا ہو گیا جنہوں نے کشمیری عالموں اور قلمکاروں میں نیا ولولہ اور جوش بھر دیا اور وہ بھی تہذیب وتمدن کے حوالے سے کوئی بڑا کام کرنے کیلئے جُٹ گئے، پنڈت آنندکول بامزئی کا نام اِن میں سرِ فہرست ہے۔ وہ مشہورِ زمانہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال سے وابستہ

ہو گئے اور انگریزی زبان میں اہم مضامین لکھے۔ اِس کے بعد اُنہوں نے کشمیر کے متعلق کئی کتابیں لکھیں جن کا مطالعہ کر کے اُن کی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اِن کتابوں میں قابلِ ذکر درجِ ذیل ہیں۔

۱۔ جموں اینڈ کشمیر جیوگرافی۔

۲۔ آرکیالوجیکل رِمنیز اِن کشمیر۔

۳۔ اے ہسٹری آف کشمیری پنڈتس۔

۴۔ للہ یوگیشوری۔

۵۔ نندریشی۔ اِس کے علاوہ وہ یورپی محقق ہنٹن نولز کے ساتھ کشمیری محاورں اور ضرب الامثال کی کتاب ''Kashmiri Proverbs and Riddles'' کی تصنیف اور تالیف میں اُن کے خاص رفیق رہے۔

پنڈت آنند کول بامزئی نے بعض اہم عہدوں پر کام کیا۔ وہ کچھ عرصے تک کسٹمز اینڈ ایکسائز محکمے کے سربراہ بھی رہے۔ وہ سری نگر میونسپل کمیٹی کے کونسلر بھی رہے جو اُن دِنوں بہت ہی معزز عہدہ مانا جاتا تھا۔ شہر کی تمام تر آرائش اور زیبائش اُس کے ذمے ہوتی تھی۔ اِس دَوران جو سرکردہ شخصیات کشمیر آئیں وہ ضرور پنڈت آنند کول بامزئی کی مہمان ہوتیں۔ اِن میں سوامی وویکانند، رابندر ناتھ ٹیگور، سر محمد اقبال، سر تیج بہادر سپرو، مشہور صنعت کار جمشِد جی ٹاٹا کے فرزند سر دُراب جی ٹاٹا اور اُن کی اہلیہ شامل ہیں۔ کشمیر کے اَدیبوں اور سرکردہ شخصیات کا بھی اکثر آنند کول کے ہاں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ مختلف علمی اور اَدبی معاملات پر بحث و مباحثے ہوتے جن میں سے زیادہ تر کا تعلق ہسٹری، اَدب، ثقافت اور زبان سے ہوتا تھا۔

پنڈت پرتھوی ناتھ کول بامزئی اِس اعتبار سے خوش قسمت تھا کہ اُس نے ایسے

ذی قدر ماحول میں جنم لیا جہاں علمی اور اُدبی نشستیں میسّر تھیں، فارغ البالی تھی اور رہبری تھی اور پشتوں کا علمی اور اُدبی خزانہ میسر تھا۔

پنڈت پرتھوی ناتھ کول بامزئی کی ادبی سرگرمیاں ایس پی کالج سری نگر سے شروع ہوئیں جہاں سے اُنہوں نے بی اے آنرز کیا؛۔ اُنہوں نے تواریخ نویسی کا آغاز بعض شخصیات مثلاً زین العابدین بڈشاہ، للتادتیہ مکتا پیڈ اور شری بھٹ کے متعلق چھوٹے موٹے مضامین سے کیا۔ اُن دنوں ایس پی کالج میں ایک خاص میڈل دیا جاتا تھا جسے سورج نرائن گولڈ میڈل کہتے تھے۔ یہ اُس طالبِ علم کو دیا جاتا تھا جو اقتصادیات کے کسی خاص موضوع پر کوئی جان دار مضمون سپردِ قلم کرتا۔ بامزئی صاحب نے ''کشمیر انڈر مغلز ۔ این اِکانومِک سروے'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا۔ اِسے بہت ہی پسند کیا گیا۔ یہ مقالہ بعد میں انڈین جرنل آف اِکانومِکس نام کے مشہور میگزین میں چھپ گیا۔ اِس سے اُن کی حوصلہ افزائی ہوئی اور اُنہوں نے اِسی طرز پر دوسرا مقالہ لکھا ''کشمیر انڈر سِکھس ۔ این اکانومِک سروے''۔ اِسے بھی بہت پسند کیا گیا۔

بامزئی صاحب چاہتے تھے کہ وہ کشمیر سے باہر جا کر اقتصادیات یا ہسٹری میں ایم اے کریں لیکن والدِ بزرگوار کی بزرگی کی وجہ سے کشمیر سے باہر نہیں جا سکے۔ اُنہوں نے یہیں اپنا بزنس شروع کیا۔ ۱۹۴۱ء میں پنڈت آنند کول بامزئی سرگباش ہو گئے اور سب کچھ چھوٹ گیا.......... لیکن بامزئی صاحب اپنے بزنس میں جُٹے رہے دوسری جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی اور اُن کا شیشے اور قلعی کا روبار چمک اُٹھا اور اُن کا نام ''قلعی کا راجہ'' پڑ گیا۔

۱۹۴۷ء میں شخصی راج کا خاتمہ ہو گیا۔ پنڈت جانکی ناتھ زتشی (جو ریاست کے ڈائریکٹر جنرل انفارمیشن اور براڈ کاسٹنگ تھے) کی ایما پر وہ اِس محکمے کے ساتھ سپیشل آفیسر کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے۔ آپ کشمیر سے متعلق ایک ہینڈ بک تیار کرنے کے

کام میں مگن ہوگئے۔ "Keys of Kashmir" نام کی کتاب جو کشمیر کے متعلق بعض جاندار مضامین کا ایک مجموعہ ہے، ترتیب دے کر چھاپ کیا گیا۔ اس کے بعد وہ دہلی میں مرکزی سرکار کے پبلی کیشنز ڈویژن کے ساتھ وابستہ ہوگئے۔ آپ ایک مشہور رِسالے کے ایڈیٹر بن گئے جس کا نام "کشمیر" تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا واحد رِسالہ تھا جس کا عمل دخل کشمیر کے ساتھ تھا۔ اس کے بعد وہ کچھ عرصے تک March of India نامی میگزین کے ایڈیٹر بنے۔ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۱ء تک بامزئی صاحب ایتھوپیا سرکار کے صلاح کار برائے اطلاعات ونشریات رہے۔

کشمیری زبان کی مکمل اور جاندار ہسٹری لکھنے کا خیال آف دِنوں اُن کے ذہن میں آیا جب وہ ریاستی محکمۂ اطلاعات کے ساتھ وابستہ تھے۔ اِس مکمل ہسٹری کی ضرورت عرصۂ دراز سے محسوس کی جارہی تھی کیوں کہ کشمیر کا مسئلہ سلامتی کونسل تک پہنچ چکا تھا۔ ملک اور مُلک کے باہر لوگ جامع، مبسوط اور مکمل تاریخ کشمیر کے متلاشی تھے۔ جب یہ بات شیخ محمد عبداللہ کے کانوں تک پہنچی جو اُس وقت ریاست کے وزیراعظم تھے کہ پی این کے بامزئی اِس کارِ خیر کو سرانجام دینا چاہتے ہیں اور اُن کے پاس پشتوں سے جمع کیا ہوا مواد جمع ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ تمام اہم دستاویز جو سرکاری تحویل میں تھیں اُن کیلئے وقف رکھی گئیں۔ جموں آرکائیوز سے ایک ہزار فائلیں منگوائیں گئیں جو بامزئی صاحب کے پاس پورے دوسال تک مطالعے کے لئے رہیں۔ اِس طرح سے اُن کی رسائی اُن دستاویزات تک ہوگئی جن کو نہ پہلے کسی نے دیکھا تھا اور نہ کسی نے ان سے استفادہ کیا تھا۔ اگرچہ اِس سے قبل بھی کشمیر سے متعلق انگریزی میں ہسٹری کی کئی کتابیں چھپ چکی تھیں جیسے صوفی محی الدین کی "کشیر" پنڈت پریم ناتھ بزاز کی "اِن سائڈ کشمیر" اور "ہسٹری آف سٹریگل فار فریڈم اِن کشمیر"۔ سابق وزیراعظم

کشمیر آر.سی.کاک کی "Ancient monuments of Kashmir" ڈاکٹر آر کے پارموکی ''ہسٹری آف مُسلم رُول اِن کشمیر'' اور پروفیسر محبّ الحسن کی ''کشمیر انڈر سلطانز۔''
اِن تمام کتابوں میں اپنے انداز میں نئی بصیرت دیکھنے کو ملتی ہے۔ البتہ اُن کا رنگ اور موضوع کچھ دوسرا ہے اور یہ کشمیر کے بعض اَدوار تک ہی محدود ہیں۔ بامزئی صاحب کسی بھی اِزم سے وابستہ نہیں تھے۔ آپ کی نظر صرف کشمیر کی اندرونی صورتِ حال تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ کشمیر اور اس کے گردونوح کی ہزاروں برس کی تواریخ اور تمدنی روایات سے بھی آپ بخوبی آشنا تھے۔ بامزئی صاحب کو اِس بات کا شدت سے احساس تھا کہ ہسٹری صرف History of Kings یا بادشاہوں کا دربار ہی نہیں جو کہ بہت سے مؤرخوں کا نظریہ رہا ہے۔ بامزئی صاحب کے نزدیک ہسٹری ہماری بات' لوگوں کے سمندروں کی بات' لوگوں کے بود وباش' اُن کے رِشتوں اور رویئے رسوم ورواج' ادبی اور فنی کمالات' خوابوں اور ارمانوں' اُن کو درپیش مسائل اور مُشکلات' طوفانوں تباہ کاریوں اور باز آباد کاریوں کی کہانی ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ اِن کی کمالات کی بنا پر اُن کی ''ہسٹری آف کشمیر'' ایک معتبر اور مستند ہسٹری تسلیم کی جاتی ہے۔ رومِلا تھاپر کا کہنا ہے۔

"Mr.Bamzais History of Kahmir is perhaps the first book of its kind . It is running History of the poltical, Social and cultural developments of the land. The book is a must for one who wants to know something about Kashmir."

سردار ایم۔ کے۔ پانیکر کہتے ہیں:۔

" This is the first serious attempt to present the story of Kashmir as a whole."

ڈاکٹر آر۔ایس۔ مجمدار لکھتے ہیں:۔

"I believe this is the first book giving a concept of the History of Kahmir. This is a great thing and the book will be very valuable for ready reference."

اِس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ تحقیق یا ریسرچ کبھی بھی ختم نہیں ہوتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اِس میں نئی باتیں سامنے آجاتی ہیں جس وجہ سے نئی ہسٹری تصنیف کرنے کا عمل برابر جاری رہتا ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں جو تحقیقی کام آرکیالوجی شعبے میں سامنے آیا ہے اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ کشمیر کے ماضی کے بارے میں بہت کچھ پڑھنا جاننا اور لکھنا باقی ہے۔ کشمیر میں اِنسان کے قدم اڑھائی لاکھ سال پہلے پڑے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ اِنسان کہاں کہاں سے یہاں آئے؟ وہ کس ذات اور نسل سے تھے اُن کی زبان کیا تھی؟ اُن کا رہن سہن کیسا تھا۔ پرانے پتھر کے زمانے سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن میں کون سی تبدیلیاں آگئیں؟ گوپھ کرال، بُرزہامہ، سمتھن، دَردہ کوٹ وغیرہ جگہوں کے آثار کھدائی کے بعد نکلے ہیں ابھی اُن پر کُھل کے بحث نہیں ہوئی ہے۔ بُرزہامہ کے آثار وادیٔ سندھ کے آثار کے دوش بدوش ایک الگ تہذیب کا پتہ دیتی ہے۔ اُس کے بعد کیا ہُوا اور کیسے مختلف ادوار وجود میں آگئے، اِس پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ شاید یہی احساس تھا جس نے بامزئی صاحب کو ''کشمیر اینڈ سنٹرل ایشیا'' کے موضوع پر ایک الگ کتاب لکھنے پر آمادہ کیا۔ یہ کشمیر کی ہسٹری کا وہ موضوع ہے جس پر ابھی مزید تحقیق اور تلاش کی ضرورت ہے۔

ہسٹری کا تعلق مجموعی طور اِنسانی زندگی سے ہے۔ گونا گوں گوشوں اور موضوعات کے ساتھ، اِسلئے اِس کا دامن بہت ہی وسیع ہوتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک مورّخ کی نظر تمام گوشوں کی طرف جائے۔ اُس کو ہر موضوع کیساتھ دلچسپی اور عبور حاصل ہو اور میرے خیال میں یہ بات

بامزئی صاحب کے حق میں جاتی ہے کہ اُنہوں نے ایک ایسی ہی تواریخ ہمارے سامنے پیش کی۔

گزشتہ کئی دہائیوں سے جو اہم کام بامزئی صاحب کے گہرے مطالعے اور عرق ریزی کے بعد ہمارے سامنے آئے ہیں' اُن میں ۱۸۴۸ء سے ۱۹۲۵ء تک اُن کی کشمیر کی تواریخ ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ اِس کے لئے اُنہیں انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ کی طرف سے تین سال تک فیلوشپ بھی دی گئی۔ یہ کتاب مہاراجہ گلاب سنگھ کے زمانے سے مہاراجہ ہری سنگھ کے تخت نشین ہونے تک کشمیر کے سماجی اور اقتصادی حالات ہمارے سامنے لاتی ہے اور ایک اچھوتا کارنامہ ہے۔

اُن کی کئی اور کتابیں یوں ہیں:۔

1۔ کشمیر پاور اینڈ پالٹکس Kashmir Power And Politics

2۔ فرام لیک سیکسس ٹو تاشقند From Lake Seuseux to Tashkant۔ یہ دونوں کتابیں پولٹیکل ہسٹری سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگر چہ اِن کتابوں کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی جن کی وہ حقدار تھیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی ورق گردانی میں اضافہ ہوگا۔ بامزئی صاحب نے اپنے والد پنڈت آنند کول بامزئی کی 'جموں و کشمیر جغرافی' نئے سرے سے چھاپ کی اور اِس میں قابلِ قدر اضافے کئے۔

گزشتہ ۲۰ برسوں سے وہ دہلی میں ایک خاموش زندگی بسر کر رہے تھے اور مجھے معلوم ہے کہ اِس دوران اُنہوں نے کئی گوہر ہائے آب دار کھنگال ڈالے۔ اُن کی بہت سی ریسرچ ابھی تک زیورِ طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکی۔ یوں ہماری تواریخ کے یہ اہم سنگِ میل وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گمنامی کی نذر ہو جائیں گے اور فی الحال ہم خوابِ خرگوش میں مگن ہیں۔ جب جاگیں گے تب بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ (کشمیری سے ترجمہ)

..............OOO..............

اوتار کرشن رازدان

آنند کول بامزئی۔ پرتھوی ناتھ کول بامزئی

کشمیر کی تاریخ کے رمز شناس

ہندوستان کے اوّلین وزیر اعظم اور تاریخِ عالم پر گہری نظر رکھنے والے پنڈت جواہر لال نہرو کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کرنا تب تک کوئی مطلب نہیں رکھتا، جب تک کشمیر کی تاریخ کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ پنڈت نہرو نے بڑی باریک بینی اور ایک بالغ نظر تواریخ نویس کی حیثیت سے کشمیر کو پڑھا تھا اور اس کا چپہ چپہ چھان مارا تھا۔ اِس لئے اُن کا ماننا تھا کہ کشمیر کا بیتا کل جتنا شاندار رہا ہے، اس کی نقاب کشائی اَب تک اس انداز سے نہیں ہوسکی ہے۔ مانا جاتا ہے کہ کشمیر کے بارے میں جتنا کچھ بیان کیا جاچکا ہے، اِس سے ہزاروں گنا ایسا ہے جس پر ابھی تک قلم نہیں اُٹھایا جاسکا ہے۔

کشمیر کی تاریخ کو کسی قدر سائنسی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں بامزئی خاندان کا بہت بڑا حصّہ رہا ہے۔ اِس خاندان کے آباء و اَجداد میں کوئی شخص کشمیر میں اَفغان دَور کے ایک گورنر نور الدّین خان بامزئی کے دَربار میں عہدیدار تھا تو اِسی نسبت سے لوگوں نے انہیں بامزئی کہا جانے لگا۔ ورنہ یہ خاندان کول نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُس زمانے میں ناموس اور شہرت حاصل کرنے کے لئے

اُنہوں نے اپنے نام کے ساتھ ''بامزئی'' جوڑ دیا ہو۔ وجہ تسمیہ کچھ بھی ہو یہ خاندان گزشتہ کئی سو سال سے بامزئی کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ اِسی خاندان سے وابستہ باپ' بیٹے یعنی آنند کول بامزئی اور پرتھوی ناتھ کول بامزئی نے فنِ تاریخ میں جو کمال کر دکھایا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جس انداز سے اُنہوں نے کشمیر کے کل کے بارے میں لِکھا ہے وہ اپنے آپ میں ایک دبستان کہا جاسکتا ہے اور کشمیر پر کام کرنے والوں کے لئے اُن کی کتابیں حوالوں سے کم نہیں۔

آنند کول بامزئی کی پیدائش اُنیسویں صدی کے آغاز میں کشمیر کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں ہوئی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد وہ سری نگر میونسپلٹی کے سربراہ بن گئے۔ وہ ایک سادگی پسند شخص تھے۔ اُن کا کھانا' پینا اوڑھنا بچھونا بالکل سادہ تھا۔ لِکھنے پڑھنے کے زبردست شوقین تھے۔ اُن کا ایک حویلی نما مکان سری نگر میں دَریائے جہلم کے کنارے واقع تھا۔ اُن دنوں کشمیر میں یورپی سیاحوں افسروں اور عالموں کا آنا جانا عام ہوگیا تھا اور آنند کول بامزئی نے اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے اُن کے حلقوں میں ممتاز جگہ بنالی۔ وہ نہ صرف فارسی اور انگریزی کے عالم تھے بلکہ کشمیری اور اردو سے بھی والہانہ لگاؤ رکھتے تھے۔ اُن ہی اَیام میں شاعرِ کشمیر مہجور کی شاعری کا چرچا عام ہوا اور اُن کی ایک نظم ''پوشے متہ جانانو'' کشمیر میں کافی مقبول ہوگئی۔ بامزئی صاحب نے بھی اِسے پسند کیا۔ اُنہوں نے اِس نظم کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور اِسے کلکتہ سے شائع ہونے والے کثیر الاشاعت رِسالے ''ماڈرن ریویو'' میں چھاپا تو چاروں طرف ہلچل مچ گئی۔ ٹیگور اِس نظم سے اتنے متاثر ہوئے کہ اُنہوں نے مہجور کو خط لِکھا کہ میں نے آپ کی نظم پڑھی۔ آپ کے اور میرے خیالات ملتے ہیں بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں نے آپ کی یا آپ نے میرے نقل کی ہو۔ اِس طرح مہجور کو کشمیر سے باہر متعارف کرانے اور

کشمیر کی لوک شاعری کی روح کو دُنیا کے سامنے پیش کرنے کا سہرا اُن ہی کے سر ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا ہے آنند کول بامزئی نے تواریخی اہمیت کی بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔اُن کے پاس قدرے محدود وسائل تھے اِس کے باوجود اُنہوں نے جس سائنسی انداز میں یہ گنج ہائے گراں مایہ تصنیف کیئے اس کو دیکھ کر اُن کی ذہانت، لیاقت، فہم وفراست اور بالغ نظر ہونے پر یقین ہوجاتا ہے۔اِن کتابوں میں 1۔آرکیالوجیکل رمینز اِن کشمیر 2۔جیوگرافی آف کشمیر 3 ۔ہسٹری آف کشمیری پنڈتس 4۔شیخ نورالدّین 5۔لل دید 6۔سری نگر وغیرہ قابل ذِکر ہیں۔

بیسوی صدی میں کشمیریوں کے ماضی کو کھوج نکالنے میں جس فرزند کشمیر نے قابلِ قدر کام کیا وہ ہیں پرتھوی ناتھ کول بامزئی، جو گزشتہ برس کے آواخر میں پچانوے سال کی عمر میں ہم سے رخصت ہوگئے لیکن دمِ واپسیں تک وہ اپنے آپ کو انٹرنیٹ وغیرہ سے جُڑے رکھے ہوئے تھے۔بامزئی صاحب نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کشمیر سے باہر رہ کر گذارا۔اُن کی قابلیت کی بناپر پنڈت جواہرلال نہرواُن کی بہت عزت کرتے تھے اور وقت کے دانشوروں اور محققوں میں وہ ممتاز مقام رکھتے تھے۔کشمیر سے باہر رہ کر بھی اُن کی روح کشمیر میں تھی اور کشمیر کے بارے میں اُنہوں نے ایساوقیع مواد پیش کیا کہ وہ اپنے عظیم باپ سے بھی کئی قدم آگے بڑھ گئے۔درجن بھر کتابوں کے مصنف ہونے کے علاوہ اُن کے سینکڑوں مقالے اِس وقت بھی محققوں اور طالبانِ علم کی راہنمائی کرتے ہیں۔ہماری وادی کے بارے میں جو ٹھوس مواد پسِ پردہ تھا اُنہوں نے اپنی نوکِ قلم سے اس کو آشکارا کردیا۔وادی ہی کیا اُنہوں نے جموں اور لداخ کا بھی تفصیل کیساتھ ذکر کیا ہے۔جب اُن کی تصنیفات کا جائزہ لیا جاتا ہے تو عقل حیران رہ جاتی ہے کہ وہ کِس استدلال کے ساتھ مختلف اُمور کا جائزہ لیتے ہیں۔ اُن کی ہر

بات کے پیچھے دلیل اور تحقیق ہوتی تھی جن کے ساتھ اختلاف تو کیا جاسکتا ہے لیکن انہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بامزئی صاحب کے چلے جانے سے ایک بہت بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے۔ اُنہوں نے کشمیر کے حوالے سے اپنی زندگی کے آخری ایام میں جو کام کیا اُس کو منظرِ عام پر لانے کی ضرورت ہے تاکہ ہماری تواریخ کے یہ اہم سنگِ میل گمنامی کی نذر نہ ہوجائیں۔

☆☆

"شیرازہ" میں چھپنے والی نِگارشات

(۱) ہر نگارش کا معاوضہ پیش کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہو۔

(۲) ہندوستانی تاریخ و تمدن اور ثقافت و ادب کے مختلف پہلوؤں پر معیاری تحقیقی مضامین قبول کئے جاتے ہیں۔

(۳) ریاست کے تمدنی اور فنی ورثے کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی مقالات ترجیحی طور پر شائع کئے جاتے ہیں۔

(۴) فنِ تعمیر، آرٹ اور مصوری سے متعلق مضامین کے ساتھ آنے والی نادر تصاویر کا الگ سے معاوضہ دیا جاسکتا ہے۔

(۵) منظومات، بشرطیکہ معیاری ہوں، قبول کی جاتی ہیں۔

محمد یوسف ٹینگ

بامزئی صاحب۔ دیوان سے دیوان خانہ تک

یہ تعارفی مضمون ممتاز کشمیری تاریخ نویس شری پی این کے بامزئی کے اعزاز میں منعقد کی گئی استقبالیہ تقریب میں پڑھا گیا، جو ۲۱/۱ کتوبر ۱۹۸۸ء کو سرینگر کے ہوٹل براڈوے کے ''دیوان خانہ'' میں منعقد ہوئی۔ ادارہ

صاحبِ صدر، محترم مہمانِ خصوصی، خواتین وحضرات!

ہمارا وطن کشمیر خوبصورت ہے، بہت ہی خوبصورت، لیکن جب کوئی شخص صرف اِس کی خوبصورتی پر ہی بار بار زور دیتا ہے تو ہم کشمیریوں کے دِلوں میں ایک شک جنم لیتا ہے۔ کیا کہنے والا کشمیر کی خوبصورتی پر زور دے کر کشمیریوں کی ذِہانت اور اُن کی لیاقت کو مُسترد کر دیتا ہے؟ یہ کوئی مریضانہ تشکیک نہیں ہے، کیونکہ مغلوں کے زمانے کے ایک بڑے حکمران نے کشمیر کے بارے میں ایک ایسا ہی جملہ کہا تھا جس سے اس بد نیتی کی بُو ابھی تک آ رہی ہے۔

''در کشمیر ہمہ چیز خوب اند، بہ جز کشمیریاں''۔ یعنی کشمیر میں، کشمیر کے باشندوں کے ماسِوا سب کچھ ٹھیک ہے۔ خوبصورتی کی اس تقسیم اور تفریق سے میرے ذِہن میں اس عورت کا چہرہ اُبھرتا ہے جس کے بوالہوس عاشق اس کے سڈول جسم کے اُبھاروں اور

گرد ابوں پر ہی نظر ڈالتے رہیں اور اپنے منہ کی رال ٹپکاتے رہیں لیکن اس کے باطن اور اس کے ذِہن کو نا قابلِ توجہ سمجھیں۔ یہ اہلِ ہوس کا کاروبار ہے اور یہ طرزِ تکلم دُشنام طرازی کا ایک پیرایۂ جس میں خود کشمیری کی حیثیت ضمنی اور ایزادی رہ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی روشن ضمیر اور روشن دِماغ کشمیری اِس قبیح ذہنیت کو قبول نہیں کر سکتا۔ خاص طور پر اِس لئے کیوں کہ کشمیریوں کے ذہنوں، اُن کے ہاتھوں اور ان کے کارناموں نے قدرت کی عطا پر اس طرح اضافہ کیا ہے کہ بعض اوقات یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ قدرت کی کاریگری زیادہ خوبصورت ہے یا کشمیریوں کے ہاتھوں کے کِھلائے ہوئے گُل بوٹے زیادہ حسین ہیں؟ یقین نہ ہو تو کشمیر کا جامہ وار شال دیکھئے جس کو پرکھ کر کملا دیوی چٹو پادھیائے نے کہا تھا کہ یہ انسانی ہاتھوں کی تخلیق کی ہوئی اعلیٰ ترین حُسن کاری کا نمونہ ہے۔ کشمیریوں کی صوفیانہ موسیقی، ان کے سنسکرت قلم کاروں کی نکتہ سنجیاں، اُن کے پارسی سرایوں کی بزم آرائیاں، اُن کے لوک ورثے کا حُسن اور اُن کے دوسرے تخلیق کاروں کی عظمتیں، ہر لحاظ سے اُن کے ماحول کی ہی طرح حسین ہیں۔ یہی آواز پی۔ این۔ کے بامزئی کے حلق سے اُن کی مشہورِ زمانہ تاریخ ''اے ہسٹری آف کشمیر'' میں یوں اُبھرتی ہے:

> ''کشمیر پر لکھنے والوں نے رُوئے زمین کی اس جنّت اور اِس کے حُسن کے مختلف پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن کسی اِکا دُکا حوالے کے سوا انہوں نے اس خوبصورت سرزمین کے باشندوں پر بالکل کوئی توجہ نہیں دی ہے۔ [1]

اس کے بعد بامزئی کا موّرخ جیسے جذبات سے مغلوب ہو کر ایک قوم پرست کشمیری کی طرح آواز بلند کرتا ہے اور اپنے دل کی بات بتاتا ہے۔

---

[1]: میں ذاتی طور اس میں سر والٹر لارنس کو ایک معزز استشناء سمجھتا ہوں۔ (م ی ٹ)

"لیکن یہی لوگ تو ہیں جو اُس حسین و جمیل وادی سے زیادہ دِلچسپ ہیں
جس میں وہ گھومتے پھرتے ہیں۔ وہ ابتداء سے ہی مظالم اور مصائب کا شکار
رہے ہیں۔ انہوں نے شمال اور جنوب دونوں اطراف سے سیاسی اور ثقافتی
اثرات قبول کئے ہیں اور ان کے بہترین جوہر اُپنے اندر جذب کر لئے ہیں۔ اسی
کا نتیجہ وہ بہت ہی وسیع ظرف ہے جو اُن کی زبان، ان کے اعتقادات اور اُن کے
رسوم و رِواج سے پھوٹا پڑتا ہے............ اسی لئے کشمیر کی تاریخ ایک زندہ قوم کی
تاریخ ہے جس کی اپنی اُمنگیں اور اپنے اندیشے ہیں۔"

کشمیر کی شخصیّت کی اس تاویل و تفسیر پر آمنّا و صدقنا کہنے والی جو سب سے پہلی آواز گونجتی ہے وہ اسی کتاب کے صفحات پر قلمبند کی گئی ہے اور یہ کشمیر کے عظیم سپوت اور رمز شناس پنڈت جواہر لال نہرو کی ہے۔ جو اِس کتاب کا دیباچہ لکھتے ہوئے ہندوستان جیسے بڑے ملک کے مصروف ترین وزیر اعظم تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"کشمیر کے متعلق جتنی بھی قیل و قال کی جائے اس کے پس منظر میں
بہرحال پر کشش کشمیری عوام موجود ہیں، جو کئی لحاظ سے بہت دلچسپ ہیں، جو اپنی
پسند اور وضع کی زندگی گذارنا چاہتے ہیں۔ اب جبکہ انہیں آزادی کی چاٹ پڑ گئی
ہے، وہ اپنے خاص انداز سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں اور اپنا وہ مخصوص کلچر
برقرار رکھنا چاہتے ہیں جس میں باہمی میل ملاپ کی الگ شناخت اور پہچان ہے
اور جو کشمیر کے ہندوؤں، مسلمانوں اور سِکھوں کی مشترکہ میراث اور متاع ہے۔"

کشمیر کی خوبصورتی کے علاوہ کشمیری عوام کے کارناموں کی خوبصورتی اور کمالات پر یہ زور اور اس پر یہ فخر پی۔ این کے بامزئے کے سچے کشمیری ہونے کا اعلان ہے۔ وہ کشمیر کو آسمانی جنّت سے زیادہ تحفّظ کا مستحق سمجھتے ہیں اور اسی لئے ہم اُن کی آواز کو یوں

بھی ادا کر سکتے ہیں: ع

فرشتے بھی آئیں، اجازت سے آئیں
یہ میرا وطن کوئی جنّت نہیں ہے

حاضرین گرامی! پرتھوی ناتھ کول بامزئی کی کشمیر اور کشمیریات سے دلچسپی اُس کی ۸۷ سالہ زندگی سے بھی قدیم ہے کیوں کہ یہ ایک کہنہ درخت کے تنے پر ایک پیوند کی طرح نصب اور پیوست ہے اور اِسی تنے کی جڑوں سے اپنے لئے نمو حاصل کرتا ہے۔ دراصل یہ اُس بڑے کام کا تسلسل ہے جس کی ابتداء اُن کے قابلِ تعظیم باپ شری آنند کول بامزئی نے آج سے ایک سو سال سے زیادہ پہلے کی تھی۔ وہ کشمیر اور کشمیریات کے عاشق بھی تھے اور پہلے کشمیری جن کے عالمانہ مضامین اپنے زمانے کے برگزیدہ علمی رسالے "جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی" کلکتہ میں چھپے۔ یہ مضامین نئے زمانے کی برگزیدہ ترین علمی زبان انگریزی میں لکھے گئے تھے اور اس زبان میں اس سطح پر کسی کشمیری کے قلم سے نکلے ہوئے پہلے اس قسم کے رشحات۔ پنڈت آنند کول نے کشمیر کی تاریخ' اس کے آثارِ قدیمہ' اس کے لوک ورثے' اس کے عظیم شاعروں لل دید اور نند ریشی اور کشمیری پنڈتوں پر رام چندر کاک سے پہلے بھی مستند اور معتبر کتابیں لکھیں' جو نہ صرف بہت سی دوسری کتابوں کیلئے تحریک ثابت ہوئیں بلکہ جن کا اعتبار اور استناد اَب بھی ختم نہیں ہوا۔ غلامی کے اُن دنوں میں جب یہاں نہ کشمیر یونیورسٹی تھی اور نہ کلچرل اکادمی کی طرز کا کوئی ادارہ' پنڈت آنند کول کا دیوان خانہ ایک دانش گاہ اور ایک اکادمی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ یہ دیوان خانہ اِس ہوٹل کے اس دیوان خانے سے جس میں ہم آپ اس وقت بیٹھے ہوئے ہیں' زیادہ معتبر اور شاندار تھا کیوں کہ وہ روایت کی پُراسرار عمارت کی برجستہ تجسیم کرتا تھا۔ یہیں پر خالص کشمیری انا

میں سوامی وویکا نند، رابندر ناتھ ٹیگور اور علامہ اقبالؔ کا استقبال اور مہمان نوازی کی گئی اور انہیں گنگناتے ہوئے سماوار سے قہوہ بھی پیش کیا گیا۔ اس زمانے میں جب موٹر گاڑیوں کا عام چلن تھا اور نہ سڑکوں کا جال، یہ مشاہیر کشتیوں میں بیٹھ کر آتے اور زینہ کول سے ملحق اس تہذیبی پنگھٹ پر کشمیریات کے خُم لنڈھا کر مست و مخمور ہو جاتے۔ یہیں پر کشمیری نوادر کا، جن میں بھوج پتر اور کشمیر کاغذ پر لکھے گئے قدیم شاردا اور فارسی مخطوطات، نایاب قلمی تصاویر، خطّاطی کے بیش بہا نمونے، کشمیر کے قدیم سکے، قالین، شال، چوب کاری کے نمونے اور پیپر ماشی کے شاہ کاروں پر مشتمل وہ شاندار گنجینہ ترتیب پایا جو اَب بھی کشمیریات کے طالب علموں کیلئے آبِ حیات کے ایک چشمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُن کے کتب خانے میں ہی حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ سے متعلق سب سے قدیم ریشی نامہ موجود ہے جو حضرت کے وصال کے ستر سال کے اندر تحریر کیا گیا ہے۔ اِسی لئے اس دیوان خانے کو ایک شاندار بیٹھک کی بجائے کشمیریات کا مصّور دیوان کہنا زیادہ مناسب رہے گا جس میں اس دلکش موضوع کے مختلف رنگوں پر ردیف وار غزلوں کا انبار لگتا تھا۔ اپنے بڑے باپ کی اس بڑی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے پرتھوی ناتھ کول بامزئی نے خود اپنی بڑائی کا اظہار اور انکشاف کیا۔ ان کی کتاب ''اے ہسٹری آف کشمیر'' کو جواہر لال نہرو نے ابتداء سے لے کر آج تک کشمیر کی تاریخ سے متعلق واحد مربوط اور مسلسل کتاب قرار دیا تھا اور اس اعتراف کے کوئی چوتھائی صدی گزرنے کے باوجود ابھی تک یہ اعزاز اس کتاب سے نہیں چھینا جا سکا ہے۔ بامزئی صاحب نے کشمیر کی سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ اس کی تہذیبی، سماجی اور اقتصادی تاریخ پر بھی بھرپور کام کیا ہے۔ اُن کی کتاب ''وسط ایشیا اور کشمیر'' اپنے موضوع کو جس طرح روشن کرتی ہے۔ اُس کی نظیر ابھی تک کسی اور کتاب میں نہیں ملتی۔ بامزئی صاحب ابھی تک مصروف ہیں اور

اُن کا قلم ابھی جوان اور روان ہے اور کشمیریات کے نئے نقشے اور زاویے ترتیب دے رہا ہے۔

معزز حاضرین! میرا کام یہ نہیں ہے کہ میں ان کے کارناموں کا تفصیلی جائزہ پیش کروں۔ اِن تعارفی کلمات کا مقصد صرف یہ ہے کہ اُس شاندار شخصیت کا ایک دُھندلا سا پس منظر آپ کے سامنے پیش کیا جائے جو آج کی شام کی رونق ہے۔ کلچرل اکادمی اِن کے کارناموں کی اہمیّت اور افادیت کا اعتراف کر کے انہیں پہلے ہی خلعتِ فاخرہ دینے کا اعلان کر چکی ہے۔ آج ہم کشمیر اور کشمیریات کے اِس دانائے راز کا سواگت ذرا خود غرضی کے جذبے سے کر رہے ہیں۔ ہم اُن کی رہنمائی میں کشمیریات کی دِلکش دُنیا میں گم ہو جانا چاہتے ہیں اور اُن سے توقع کرتے ہیں کہ وہ اس خواب زار کے راز اور اسرار سے باخبر ہونے میں ہماری رہنمائی کریں گے۔ میں اب آپ کو اور بامزئی صاحب کو ایک دوسرے کے مدِ مقابل لا کر رخصت ہونا چاہتا ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ محترم صدرِ محفل کی وساطت سے آپ اس شام کو ایک یادگاری شام بنانے کے لئے اپنے سوالات بھی کریں گے اور جوابات سننے کی تاب بھی لائیں گے۔ شکریہ!

☆☆☆

☆ اپنی نِگارشات صاف صاف، اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھیں۔ تبدیلی پتہ / یا فون نمبر بدلنے کی صورت میں ہمیں مطلع کرنا نہ بھولیں۔ (ادارہ)

پروفیسر فدا محمّد حسنین

مورّخِ کشمیر
پی۔ این کول بامزئی

کولؔ، کشمیری پنڈتوں کی قدیم گوت ہے۔کولؔ اُسے کہتے ہیں جو دُنیاوی خواہشات کو نیست و نابود کرنے والا ہو۔اس گوت کا جنم ایک نہایت ہی متبرک اور اعلیٰ برکات کی ہستی سے ہوا ہے۔ کشمیری پنڈتوں میں کولؔ خاندان ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے اور ہمارے وطن کے بعض نامور امرا، فضلا، حکما، علما کا تعلق اسی خاندان سے رہا ہے۔ کاروبار، حیثیت اور ملازمت کی وجہ سے کول خاندان کے ساتھ تمثیلاً ایسے الفاظ لگ گئے ہیں جو کول خاندان کے افراد کو پہچاننے میں مدد دیتے ہیں۔ چنانچہ جب کول خاندان کے افراد نے افغان صوبہ دار سردار نورالدّین خان بامزئی اور بلند خان بامزئی کی ملازمت اختیار کی تو اپنے آقاؤں کے نام کے ساتھ ان کی نسبت بامزؔئی قرار پائی اور وہ اسی نسبت سے پہچانے جاتے ہیں ۔اس خاندان کے بزرگوں نے کشمیر کی تواریخ، تصوف، مذہب، اور جغرافیہ پر کئی کتابیں لکھی ہیں جو ہم کشمیر کا قیمتی تمدنی ورثہ ہے اور جس پر ہم فخر کر سکتے ہیں۔ سب سے پہلے کولؔ گوت کے بامزئی قبیلہ میں پنڈت آنند کول بامزئی کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔

پنڈت آنند کول بامزئی 1931ء میں سری نگر میونسپل کمیٹی کے پریذیڈنٹ

رہے ہیں۔آپ نے تصوف، تاریخ اور تمدن پر انگریزی میں کئی کتابیں لکھیں جن میں مندرجہ ذیل اہم ہیں۔

۱۔ للہ دید، شیخ العالم نندہ ریشی اور پیر پنڈت بادشاہ پر تصانیف
۲۔ جغرافیہ جموں و کشمیر، (انگریزی) کلکتہ، ۱۹۲۵ء
۳۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔ کشمیری تاریخ پر مضامین ۱۹۱۲ء
۴۔ کشمیر کے آثار قدیمہ (انگریزی) ۱۹۳۵ء
۵۔ کشمیری پنڈت، (انگریزی) ۱۹۲۴ء
۶۔ کشمیری زبان پر مکالے

آپ کے نامور فرزند پنڈت پی۔این۔کول بامزئی نے، اپنے والدِ بزرگوار کے علمی کارناموں کو جاری رکھا اور تحقیق و تفتیش کا کام شد و مد سے جاری رکھا۔انہوں نے کشمیر کے فن، یہاں کی تہذیب، بدھ مت، گندھار، آرٹ، فوک، ڈانس، تجارت، اقتصادیات پر ملک کے نمایاں میگزین اور جریدوں میں شائع کئے جو نہایت مقبول ہوئے۔

۱۹۶۲ء میں پنڈت پی۔این کول بامزئی کی معرکتہ آرا تاریخ کشمیر، ابتدا سے حال تک، دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کا تعارف، پنڈت جواہر لال نہرو، وزیر اعظم ھند، کے تاثرات سے ہوا' جو کتاب کے اوّلین صفحات کی زینت بنے۔اس تاریخ میں، قبل از تاریخ، کشمیر کی وادی، مختلف قبیلوں کی آمد، اور ابتدائی تہذیب و تمدن کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس کے بعد بدھ دور، اور کنشک کے دور میں چوتھی بدھ کانفرنس کا تذکرہ اور مہایانِ بدھ ازم کا وسطی ایشیاء، چین اور کوریا میں پھیلنے کا ذکر ہے۔

اِس تاریخ میں، ہندو دُور حکومت کے راجگان، گونندا (1182 B.C) قبل مسیح سے کشمیر کے نامور حکمران للتادتیہ (692 A.D) تک کے حالات لکھے ہیں۔اس کے

بعد ساتویں صدی سے لے کر کشمیر کے آخری ہندو حکمران ادیان دیو (1338) کے حالات بیان کئے ہیں۔ ہندو دُور کے حالات کا تذکرہ کلہن اور جونا راجا، کی راج ترنگنی سے ماخوذ ہے۔ اسکے علاوہ مصنف نے اپنے والد بزرگوار کی تصانیف سے استفادہ حاصل کیا ہے۔ اس دور کے آثار قدیم اور منادر کی تفصیل بھی اپنے والد کی آثارِ قدیمہ کی کتاب حاصل کی گئی ہیں۔

ہندو دور کے بعد فاضل مصنف نے مسلم سلاطین کا تذکرہ کیا ہے اور اس دور کے مورّخ صاحبان، مثلاً پیر حسن شاہ کھوہامی، تاریخ اعظمی، تاریخ بیربل کاچرو سے استفادہ حاصل کیا ہے۔ اس کے بعد مصنف نے مغل دُور حکومت، افغان دور حکومت کے تمام اہم واقعات قلمبند کئے ہیں۔

مصنف کا وہ حصہ جو سکھ دور اور ڈوگرہ دور سے متعلق ہے، کافی معلومات پر مبنی ہے۔ لیکن ۱۹۲۷ء کے بعد ۱۹۶۲ء تک کے واقعات ذاتی مشاہدے اور معلومات کی بنا پر لکھے گئے ہیں۔ تاریخ کشمیر کا یہ حصہ نہایت ہی اہم ہے۔ انگریزی میں جو تاریخ کشمیر لکھی گئی ہیں، ان میں جی، ایم، ڈی صوفی کی کشیر، دو جلد، اوّل درجہ رکھتی ہے۔ اس کے بعد، پنڈت پی، این کول بامزئی کی تاریخ کشمیر دوسرے نمبر پر ہے۔

۲۲/۲۳/۲۴/ ستمبر ۱۹۸۹ء سری نگر کلب میں کشمیر کونسل آف ہسٹاریکل اور کلچرل ریسرچ کے زیر اہتمام ایک سیمنار منعقد ہوا جس میں ایک سو کے قریب اسکالر، سیاست دان اور مفکروں نے حصہ لیا۔ سیمنار کا موضوع تھا، کشمیر کے پانچ ہزار سال۔ اس سیمنار میں پنڈت پی۔ این کول بامزئی نے اپنا مقالہ پیش کیا جس کا موضوع تھا Origin of the land & people of Kashmir جو بہت سراہا گیا۔ (مذکورہ مضمون اِس شمارے میں بطور ضمیمہ شامل کیا گیا ہے۔) ☆

پی این کے بامزئی

پنڈت آنند کول بامزئی

اپنے ہم وطنوں کی آزادی وخودمختاری کے حصول کی خاطر جن کشمیریوں نے اس صدی کے آغاز ہی سے کلیدی رول ادا کیا اُن میں پنڈت آنند کول بامزئی ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ وہ ۲۴ اپریل ۱۸۶۷ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ وہ پنڈت طوطارام کول بامزئی کے اکلوتے بیٹے تھے جو اُس وقت محکمہ مال میں کاردار کے منصب پر فائز تھے۔ پنڈت آنند کول بامزئی نے بچپن اور اپنی جوانی کے دن آرام سے گزارے۔

چیچک، خسرہ، ٹائیفائڈ، ہیضہ اور نمونیہ جیسی متعدد اور متعدی بیماریوں، جن سے اُن دِنوں بچے کثرت سے لقمۂ اجل ہوتے تھے، سے بچ نکلنے کے بعد انہیں سات سال کی عمر میں مقامی سکول (ژاٹہال) بھیج دیا گیا[1]۔ یہ روایتی تعلیمی ادارے کشمیر کی قدیم اور مشہور زمانہ دانش گاہوں کے خستہ حال آثار کی حیثیت رکھتے تھے، جو نیم خواندہ خاندانی اساتذہ کی نگرانی میں چلائے جاتے تھے۔ وہ یہ مکتب اپنے گھروں کے تنگ و تاریک کمروں میں لگاتے تھے۔ یہاں کی تعلیم سنسکرت، عربی اور فارسی کی چند بنیادی کتابوں تک محدود

---

[1]: ژاٹھ۔ شاگرد، ہال۔ مقام، جگہ۔ روایتی تعلیمی ادارہ۔ جہاں بچوں کو اگلے وقتوں میں تعلیم دی جاتی تھی، ہم اِسے عرفِ عام میں مکتب کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ کشمیر میں اب بھی "ژاٹہال" ابتدائی تعلیمی اِداروں کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

تھی۔خوش بخت تھے وہ لوگ بھی جو اِتنی تھوڑی سی تعلیم کے حصول پر بھی فخر کر سکتے تھے لیکن آبادی کا باقی اکثر حصّہ ساری عمر علم کے نوُر سے محروم ہی رہتا تھا۔یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ مغل، پٹھان، سِکھ اور ڈوگرہ حکمرانوں (گورنروں) کی ریشہ دوانیوں اور چیرہ دستیوں نے بچارے کشمیریوں کو جہالت، مفلسی اور لاچاری کی پستی میں مبتلا کیا تھا۔ وہ دن اَب ماضی کی یادگار ہو چکے تھے جب وہ سنسکرت اور فارسی میں گرانقدر ادبی خدمات، شِو مت اور تصوف کے اِنسانی فلسفۂ مجسمہ سازی، فنِ تعمیر اور دیگر فنون لطیفہ میں تخلیقی جوہروں کے لئے چار دانگِ عالم میں مشہور ہی نہیں، محترم بھی تھے۔

اُنیسویں صدی کے اختتام تک کشمیری عوام دبی کچلی مخلوق کی حیثیت سے نمایاں طور ہمارے سامنے آتے ہیں۔اپنے وطن عزیز میں اُن پر بے زبان حیوان سمجھ کر حکمرانی کی جاتی تھی اور وطن سے باہر اُنہیں طعن و تشنیع اور تضحیک کے وار چُپ چاپ سہنے پڑتے تھے۔

سرکاری طور تعینات کئے گئے ٹیکس جمع کرنے والے حریص اور جابر اہلکار کِسانوں سے اُن کی محنت کا پھل لوُٹ لیتے تھے..........وہ سارا سال سنگھاڑے کھا کھا کر گُزر اوقات کرتے تھے اور نہایت ہی خستہ حال مٹی کی بنی ہوئی جھونپڑوں میں رہتے تھے۔شالبافی کی صنعت، جو صدیوں سے شہر باشوں کا ذریعۂ معاش تھی، بے جا ٹیکسوں کے بوجھ تلے دُم توڑ چکی تھی۔ بیماری اور قحط زدگی کا عالم طاری تھا۔اس پر مستزاد یہ کہ اُنہیں بیگار (جبری اور بِلا اُجرت مزدوُری) کی ظلم کی چکی میں پیسا جاتا تھا۔ یہ اور ایسے دوسرے دِل ہلانے والے واقعات جن میں ۹۷-۱۸۷۷ء کے تباہ کُن قحط کے نتیجہ میں بھوک مری کے واقعات بھی شامل ہیں، جب کشمیر کی دو تہائی آبادی لقمۂ اجل ہوئی، کیونکر ایک چھوٹے حساس بچے کے نازک دل پر گہرا اثر نہ چھوڑتے۔چودہ سال کی عمر میں وہ مکتب سے فارغ التحصیل ہو چکے تھے اور بلا تأمل

سرکاری نوکری حاصل کر سکتے تھے' جو کشمیری نوجوان کا منتہائے مقصد تھا۔ لیکن وہ ایسا نہیں سوچتے تھے کیونکہ مکتب کی روایتی تعلیم کے دریچے سے وہ وسیع دُنیا کا نظارہ نہیں کر سکتے تھے۔ دُنیائے یورپ کی سائنسی' ادبی کامیابیوں اور کارناموں کی گونج کشمیریوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ یہ ننھا بچہ ایسے واقعات غور سے سُنا کرتا تھا اور اپنے علم کی پیاس بجھانے کا متمنی تھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ جدید علوم کی کُنجی بلاشبہ انگریزی زبان کے گنجینۂ علم میں پوشیدہ ہے۔ ایک کامل انگریزی اُستاد کی تلاش بے معنی تھی کیونکہ اس تنہا اور دور اُفتادہ وادی میں اُن دنوں ایسے لوگ نایاب تھے۔ بخت نے یاوری کی۔ کشمیر کی جنگی اہمیت ہند کی حکومتِ برطانیہ پر آشکار ہو چکی تھی۔ انہوں نے مہاراجہ کشمیر کے جُملہ سِول اور فوجی اختیارات بحال کرنے کے منصوبے درپردہ باندھے تھے۔ وادی میں خصوصی اختیارات والے افسر کی تقرری موسم گرما کے چھ ماہ کے لئے عمل میں آتی تھی' اور ریزیڈنٹ کی تقرری جس کی مہاراجہ گلاب سنگھ نے شدید مخالفت کی تھی' اُس کی موت پر روبہ عمل آئی۔ چرچ مشنریوں کے ورودِ کشمیر کے بعد سامراجی مداخلت شروع ہوئی۔ پہلا انگریز جو کشمیر میں آکر انگریزی میڈیم سکول قائم کرنے کے منصوبے باندھتا ہے' جان اسمتھ ڈاکسی ہے۔ مہاراجہ کی انتہائی مخالفت کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا۔ ۱۸۸۱ء کے دوران ایک صبح پنڈت آنند کول اور پنڈت نرائن داس اُسکے سامنے حاضر ہوتے ہیں اور اُسے انگریزی اور دوسرے مضامین میں تعلیم دینے کی درخواست کرتے ہیں۔ اُسی وقت وہ اُن کے لئے متعلقہ کُتب لا کے دیتا ہے۔ کلاس شروع ہوتی ہے اور مشہور چرچ مشن سکول وجود پذیر ہوتا ہے۔ یہی وہ تعلیمی ادارہ ہے جس نے کشمیر میں سماجی بہبود اور تعلیم کے اعلیٰ مقاصد حاصل کرنے میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔

ان دُو ننھی سی جانوں کی خاطر یہ کوئی سیدھا سا معاملہ تو نہیں تھا۔ اُنہیں اپنی ذات برادری، بالخصوص اپنے احباب و اقارب کا بُرا بھلا سہنا پڑا۔ عام عقیدہ تو یہی تھا کہ عیسائی مشنریوں کا یہاں آکر واحد کام یہی ہے کہ وہ کشمیریوں کا مذہب تبدیل کرا کے انہیں عیسائی بنائیں۔ اُن کا گمان تھا کہ یہ دو بچے بھی عیسائیت کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں جس سے انہیں نجات دلانا ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے عزمِ صمیم کو اُن کے والدین اور دوسرے رشتہ داروں کی کوششیں پسپا نہ کرسکیں ...... پنڈت آنند کول بامزئی کے کہنے کے مطابق ڈاکسی صاحب اعلیٰ پایہ کے عالم تھے۔ اُن کے علم حاصل کرنے کے جذبے کی قدر کرتے ہوئے اُنہوں نے اُن کی دل و جان ممکنہ حد تک تعلیم و تربیت کی۔ صرف دو سال کی قلیل مدت میں یہ دونوں لڑکے انگریزی میں انشائیے، افسانے لکھ سکتے تھے اور انگریزی بغیر کسی رُکاوٹ کے بول بھی سکتے تھے۔ انہوں نے الجبرا، جیومٹری، تاریخ اور جغرافیہ سبھی مضامین پڑھ لئے تھے اور اب کمسٹری، فزیکس بھی سیکھ رہے تھے۔ ان کی علمی وسعت میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ اُن کی عزت و تکریم بھی ہونے لگی۔

ڈاکسی صاحب ۱۸۸۳ء میں انگلینڈ چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد جے ہنٹن نوولز وارِدِ کشمیر ہوئے۔ نوولز صاحب، ڈاکسی صاحب کے ہم پلّہ اُستاد اور عالِم تھے۔ اُن کی پنڈت آنند کول بامزئی پر نظرِ التفات پڑی۔ کشمیری زبان اور لوک ادب کا مطالعہ کرنے کے دوران نوولز صاحب کو اُپنے شاگردِ رشید پنڈت آنند کول بامزئی کا عملی تعاون حاصل رہا۔ اتنے گہرے روابط سے لوگ یہ خیال کرنے لگے کہ پنڈت آنند کول بامزئی نے در پردہ عیسایت کے عقیدہ کو گلے لگایا ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اُن کے والد کو بُلا کر صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اُس کے بیٹے نے مذہب تبدیل کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہو تو اُسے کہدو کہ وہ حُکماً مہاراجہ کی موت، جو بہت قریب ہے، انتظار

کرے۔ پنڈت آنند کول بامزئی کو اپنے والد نے یہ ثابت کردکھانے کو کہا کہ اس نے اپنے آباداجداد کا مذہب نہیں چھوڑا ہے۔ ایسا وہ مہابھارت کے مطالعہ اور اس کے فارسی ترجمہ کی نقل تیار کرنے سے ثابت کرسکتا تھا یہی وہ شرط تھی جو اُس کو پوری کرنا تھی۔ اُس کے والد نے اُسے بتادیا کہ اگر وہ ایسا کرسکے تو وہ نہ صرف مشن سکول میں اُس کی تعلیم جاری رکھنے کی حمایت کرے گا بلکہ مہاراجہ اور ذات برادری کی مخالفت کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کرے گا۔ بیٹے نے یہ چیلنج قبول کیا اور ساتھ ہی وقت طلب اور صبر آزما کام میں جٹ گیا۔ رزمیہ کا وہ نادر قلمی نسخہ جو اُس نے چھ ماہ کے مقررہ وقت میں تیار کیا آج بھی ہماری گرانقدر امانت کے طور محفوظ ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ یہ نقل صاف، خوشخط اور بغیر کسی غلطی کے ہے۔

اس طرح ساری مخالفت کا زور گھٹ گیا اور پنڈت آنند کول بامزئی نے نو ولز صاحب کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا۔ اس تحقیقی کام کے لئے نہ صرف انگریزی بلکہ سنسکرت، فارسی اور کشمیری کا مطالعہ لازمی تھا۔ نو ولز کی دو کتابوں "(Folk Tales of Kashmir)" اور دوسری تالیفات وتصنیفات پر پنڈت آنند کول بامزئی کی عالمانہ بصارت اور تر دماغی کی مہر ثبت ہے۔ اس بات کا اعتراف نو ولز نے خود بھی کئی مقامات پر اپنی تحریروں میں کیا ہے۔

نو ولز کی سرپرستی میں دُو سال کے گہرے مطالعہ اور مسلسل تحقیق نے پنڈت آنند کول بامزئی کو اپنے طور ایک جید عالم بنادیا۔ مشن سکول کا حلقہ وسیع ہوتا گیا، اور اب وہ دو سو لڑکوں تعلیم دیئے جانے پر فخر محسوس کرسکتے تھے۔ نو ولز کے لئے پنڈت آنند کول بامزئی سے بہتر کون دوسرا ہوسکتا تھا جو مشن سکول کا پہلا ہیڈ ماسٹر مقرر ہوتا کیونکہ وہی اُس کا پہلا کشمیری شاگرد تھا جس نے سب سے

پہلے انگریزی زبان سیکھی تھی۔ اُس نے انہیں مشن سکول کے صدر مدرس کی حیثیت سے تعینات کیا اور ساتھ ہی یہ بھی درخواست کی کہ وہ تحقیقی کام میں اُس کی مدد بھی جاری رکھیں گے۔ مزید چھ سال تک مشن سکول کو منظّم کرنے کے علاوہ اُن کا گہرا مطالعہ بھی جاری رہا۔ اُنہیں مقابلتاً بہت زیادہ علم وآگہی حاصل ہوئی جو انہیں معمولاً کسی دانش گاہ میں خصوصی مطالعہ اور تحقیقی مقالہ تیار کرنے سے حاصل ہوتی۔

۱۸۸۵ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کی موت کے بعد حکومت کے نظام میں انقلابی تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو بڑی جلدی میں معزول کر کے اُس کے بھائی راجہ امر سنگھ کو ریجنسی کونسل (Regency Council) کا صدر نامزد کیا گیا۔ یہاں کی وزارتی کونسل کو حکومت ہند کے برطانوی ریزیڈنٹ کے تحت کام کرنا تھا اِس سے یہ بات عیاں ہے کہ اصلی حکمران انگریز ہی تھے۔ فارسی زبان' درباری زبان کا درجہ رکھتی تھی' کی جگہ انگریزی اور اُردو نے لے لی۔ ریاست سے باہر کے لوگوں کو ملازمت میں بھرتی کیا گیا اور یہاں کے لوگوں کو غیر کشمیری' سنگدل' جابر اور بوالہوس حُکام کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ اپنے تعلیمی پسِ منظر میں پنڈت آنند کول بامزئی بلا کسی دِقت کے سرکاری نوکری کر سکتے تھے۔ لیکن اُنہیں اپنے پیشے سے اتنا اُنس پیدا ہو چکا تھا کہ سرکاری نوکری سے وابستہ کروفر اور زیادہ تنخواہ کی اُن کے سامنے کوئی وقعت نہیں تھی۔ انہوں نے بعد میں لکھا کہ مقدر تک ہماری بصارت کی رسائی کہاں۔ چنانچہ اُسی نے مجھے یہ سرکاری منصب قبول کروایا۔ بات یوں ہوئی کہ اپریل ۱۸۹۰ء میں اُن کے اور نولز کے درمیان کسی اصولی نکتہ پر اَن بن ہوئی' جس کے نتیجہ میں انہوں نے مشن سکول کی نوکری چھوڑ دی۔ اس امر کے باوصف کہ نولز ایسا نہیں چاہتے تھے۔ اپنے الوداعی کلمات میں انہوں نے ان کی ذہانت' وفا شعاری اور سب سے بڑھ کر آزمودہ کار مدرّس کی حیثیت

میں انجام دی گئی خدمات کی بڑی سراہنا کی۔

مشن سکول کی صدر مدرسی چھوڑ دینے کی خبر سُنتے ہی راجہ امر سنگھ نے اُنہیں اپنے دفتر کے ''شریف'' عہدہ کی پیش کش کی۔ اُنہیں وزارتی کونسل کی میٹنگوں میں بیٹھ کر ریزی ڈنٹ کے مطالعہ کے لئے انگریزی میں روداد قلمبند کرنا ہوتی تھی۔ یہ بڑی ذمہ داری کا منصب تھا۔ بالخصوص سیاسی طور ایسے نازک برسوں میں۔ سرکاری نظامت کار میں دیانت داری' ذہانت وذکاوت اور فرض شناسی کی بناء پر ان کا تیزی سے ترقی کرنا بجائے خود ایک دلچسپ کہانی ہے۔ اُنہوں نے جس محکمہ میں بھی کام کیا' وہاں اپنے اَمٹ نقوش چھوڑے۔ وہ ترقی کرتے کرتے سرینگر مونسپلٹی کے صدر کے اعلیٰ منصب پر پہنچے جسے انہوں نے ناؤ دسے بود کر دیا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے وقت وہ ریاست کے سب سے زیادہ تنخواہ پانے والے ملازم تھے۔ انکی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کے لئے دفتروں کے دفتر درکار ہیں۔ فطرت سے اُن کا بے پناہ لگاؤ' اُنکی دیانت داری' توہم پرستی کی مخالفت' اُن کا بے لاگ ذاتی کردار' جہالت اور مہلک تقدیر پرستی کے خلاف اُنکی جدوجہد جیسے چند ایک پہلو ہیں، جو وضاحت چاہتے ہیں۔

فی الحال ہم اپنا مطالعہ اِسبات تک محدود رکھیں گے کہ انہوں نے تاریخ نویسی، آثار قدیمہ' زبان وادب اور لوک ادب میں ہمیں کیا کچھ دیا۔

اپنی ڈائری میں انہوں نے لکھا ہے کہ ''اُنکی ذاتی مسّرت کے عناصر ترکیبی' منظم ذہنی تربیت' سچی محبت اور عام اِنسان کی بہبودی' ایثار وخلوص کے سچے جذبات ہیں'' پنڈت آنند کول بامزئی کی زندگی ایک مورخ اور ادیب کی حیثیت سے اُسی وقت سے شروع ہوتی ہے جب وہ نووِلز کے شاگرد ہی تھے۔ نووِلز کے ساتھ تحقیقی کام میں اُنکی

معاونت کا ذکر پہلے ہی آچکا ہے۔ اُنہیں اُس وقت قلم ہاتھ میں لینا پڑا جب اُنہیں کشمیریوں کے حقوق و مراعات کے لئے آواز اُٹھانا پڑی تا کہ اُنہیں سرکاری حکام کی بے انتہا چیرہ دستیوں سے نجات ملے۔ ۱۸۷۷ء ۔ ۷۹ کے تباہ کن قحط کی بعد والی دہائی میں جب وادی کی دوتہائی آبادی صفحۂ ہستی سے مٹ گئی' قحط زدگی کے آثار اپنی انتہا کو پہنچے۔ اِنسانی قوت' محنت کی کمی' بیج دستیاب نہ ہونے' ہل جوتنے کے لئے بیلوں اور دیگر آلاتِ کشاورزی کی کمیابی سے گیہوں اور دھان کی اتنی کم فصل ہوگئی کہ لوگوں کو دووقت کی روٹی مہیّا ہونا مشکل ہوئی۔ اُس وقت جب اُنہیں ہر طرح سے سرکاری امداد کی ضرورت تھی' اناج کی زبردستی وصولیابی اور جبری محنت جیسے ہتھکنڈوں سے اُن کی مصیبتوں میں اضافہ کیا گیا۔ یہ سب کچھ لداخ اور گلگت میں تعینات فوجیوں کے لئے ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی کے نام پر کیا گیا۔ اس کام میں اُنہیں حکومت برطانیہ کا پورا تعاون حاصل تھا۔ ہر طرف ہاہا کار مچی اور آواز اُٹھی کہ ہمیں گلگت سے بچاؤ۔

ظلم وجبر کے نظارے پنڈت کے لئے نا قابلِ برداشت تھے اس لئے اناج کی جبری وصولیابی اور بیگار کے خلاف انگلوانڈین پریس میں مہم چلائی۔ اُن کی تحریریں ظلم و جبر کی ہولناک داستانوں سے مملو تھیں یہاں تک کہ ریزیڈنٹ نے مصدقہ اطلاعات پر اس بے رحم طریق کار کو فوراً بند کرادیا۔ اُنکی تحریروں کے مطالعہ سے آج بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ انہوں نے برطانوی حکام کو بے رحمی اور نا اہلیت کے الزامات دیئے۔ یہ تحریریں آج ہمیں بے ضرر لگیں گی لیکن اُن دنوں کے سامراجی تسلط کے دوران معمولی تنقید بھی تباہ کن نتائج سے خالی نہیں تھی۔ خصوصاً گلگت جیسے نازک معاملہ پر۔ لیکن پنڈت نے مہم جاری رکھی۔

کشمیر کی سرحدوں پر یہ دہائی سیاسی طور بھی بڑی اہم تھی۔ برطانوی حکومت نے

اپنی شاہی فوج وسطی ایشیأ میں روس کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے اپنی متعلقہ سرحدوں پر تعینات کی تا کہ حفاظتی انتظامات مضبوط ہوں ۔ ریاست کا نظم ونسق برطانوی حکومت نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ ہُنزا، نگر اور چترال کے سرحدی علاقوں پر وہاں کے قبائلی سرداروں کے ساتھ مڈبھیڑ کے بعد قبضہ جمالیا گیا۔

کشمیر اَچانک دُنیا کی دلچسپی کا مرکز بنا اور پریس والوں کے لئے توجہ کا محور بھی۔ اینگلوانڈین پریس کو یہاں کشمیر میں ایک معتبر و معتمد نمائندے کی تلاش تھی جو اہم واقعات کی اطلاعات کی فراہمی میں اُن کی مدد کر سکے۔ گلگت ٹرانسپورٹ سروس اور کشمیر کے غریب عوام پر اُس کی جانب سے ڈھائے گئے ظلم و جبر کے واقعات سے متعلق پنڈت آنند کول بامزئی کی فکر انگیز، پُر خلوص اور بے لاگ رپورٹوں نے لاہور سے شائع ہونے والے سِول اینڈ ملٹری گزٹ اور الہ آباد کے پوئینئر (Pioneer) کے مدیروں کو بہت متاثر کیا تھا۔ دونوں اخبارات نے اُن کو اپنے اخبارات کی نمائندگی قبول کرنے کی درخواست کی۔ مسٹر کے، رابنسن، سِول اینڈ ملٹری گزٹ کے ایڈیٹر نے ۱۶را کتوبر ۱۸۹۱ء کو تار کے ذریعہ لکھا ''براہِ کرم ہمارے نمائندہ کی حیثیت سے کام کیجئے۔ تار کے ذریعہ ہر واقعہ کی تفصیلات بھیج دیجئے، بالخصوص تقریروں وغیرہ کی۔'' پیش کش پُر کشش ہونے کے باوصف قبول کرنا مشکل ہی تھی۔ اس کا صاف مطلب مہاراجہ کی ناراضگی کو مول لینا تھا۔ ایڈمنسٹریشن بھی ایسے طرزِ عمل سے خوش نہیں تھی اور پھر وہ ریاستی سرکار کے مستقل ملازم بھی تھے۔ گو کہ ابھی تک ملازمت کے قواعد وضوابط تشکیل نہیں پاچکے تھے۔ اُن کے لئے ایک دیانتدار صحافی کی حیثیت سے کام کرنا آسان نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے سرپرست ڈاکٹر اے، متر اسے مشورہ کیا جس نے انہیں صلاح دی کہ وہ اپنے وطن عزیز کی خدمت کرنے کا یہ نادر موقعہ ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ پنڈت آنند کول بامزئی نے

اس طرح کشمیر کا پہلا صحافی ہونے کا مرتبہ حاصل کیا۔ اُس وقت جب یہاں کے لوگ ابھی لفظ اخبار سے بھی واقف نہیں تھے انہوں نے اِسے اپنے ہم وطنوں کی بہتری کے طاقت ور ذریعہ کے طور برتا۔ وہ اکثر اوقات اہم واقعات کی تفصیلات اُن کو روانہ کرتے۔ اُن کی ڈاک کے ذریعہ بھیجی گئی اطلاعات میں کشمیر میں ہونے والی سبھی سماجی، سیاسی اور تمدنی سرگرمیوں سے متعلق اطلاعات ہوا کرتی تھیں۔ وہ ۱۹۰۱ء تک ان اخبارات کے نمائندہ کے طور کام کرتے رہے۔ جب تک انہوں نے جمّوں میں آبکاری کے محکمہ (Customs Deptt.) کا چارج سنبھالا۔ خوش بختی سے ان اخبارات کو فراہم کی گئی اطلاعات کی نقول وہ اپنی جگہ بھی محفوظ رکھتے تھے جو تاریخ کشمیر کے اس عبوری دَور کی سماجی، سیاسی تاریخ کے مواخذ کا کام دیں گے۔

پنڈت آنند کول بامزئی نے اپنے وطنِ عزیز میں کشمیری عوام کے ساتھ رَوا رکھی گئی بے انصافیوں کے خلاف احتجاج کیا اور اُس توہین و تضحیک کے خلاف آواز اُٹھائی جس کا وہ نشانہ بنے تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ سبھی سرکاری ملازمتوں پر غیر کشمیری قابض تھے اور اپنی بالادستی، برتری برقرار رکھنے کے لئے وہ قواعد وضوابط کی رکاوٹیں یہ کہہ کر دور کرتے تھے کہ کشمیری "بددیانت، دغاباز اور ظلم پرست" ہیں۔ انہوں نے ان حالات کے پیشِ نظر "کشمیر۔ کشمیریوں کا" جیسا نعرہ بلند کیا۔ ۲۲/ اکتوبر ۱۸۹۳ء کی سِول اینڈ ملٹری گزٹ کی اشاعت میں شائع شدہ رپورٹ میں انہوں نے توہین و تضحیک، اور ظُلم و جبر کی ہولناک داستان پیش کی جس کا شکار وہ دوسرے درجہ کے بے رحم غیر ریاستی حُکام کے ہاتھوں ہوتے تھے۔ اُنکا خیال تھا کہ جب تک نظم ونسق کے معاملات میں کشمیریوں کا اوپر سے نیچے تک عمل دخل نہیں ہوگا، حالات سُدھر نہیں سکتے اور نا ہی اُن کو اپنا جائز مقام مل سکتا ہے۔

اُنہوں نے ۱۹۲۸ء تک اپنی چالیس سالہ جدوجہد جاری رکھی جب کہ مہاراجہ رائے عامہ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوا اور اُس نے سرکاری ملازمتوں کے لئے غیر ریاستی باشندوں کی تقرری پر پابندی لگائی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم اُنہیں کشمیریوں کی جانب سے یہاں کے لوگوں کو ملک اور ملک سے باہر لکھنے والوں کے ہاتھوں چلائی جانے والی' بدنام کرنے' کی مہم کے خلاف مقابلہ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس ضمن میں کوئی بھی توہین آمیز یا غیر شایستہ مُشاہدہ اُنکی جانب سے جواب دیئے بغیر نہیں رہتا۔ انہوں نے اپنے مضامین اور اس قسم کی دوسری تحریروں کے ذریعہ بے بنیاد اور بے ہودہ الزامات کی تردید باضابطہ یہاں کی تاریخ و تمدن سے مثالیں دے دیکر بڑی وضاحت سے کی اور کشمیریوں کی شرافتِ نفس اور بلند کرداری کو ثابت کر دکھایا۔ وہ ایسے توہین آمیز مُشاہدات تحریر کرنے والے حضرات کے ساتھ ذاتی مباحث بھی کرتے' اگروہ یہاں کشمیر میں موجود ہوتے۔

۱۸۸۵ء میں سِول اینڈ ملٹری گزٹ میں اُن کا ایک فکر انگیز مضمون زیرِ عنوان "کشمیری کردار" شائع ہوا جس میں انہوں نے کشمیریوں سے متعلق غیر شایستہ الفاظ کی، جو ایک عیسائی مشنری نے اپنے دعائیہ گیت میں شامل کئے تھے کہ کشمیریوں کو اپنی نوجوانی کے ساتھ ہی جھوٹ بولنے اور دھوکہ بازی میں مہارت حاصل ہوتی ہے، پُر زور تردید کی۔ ۱۹۰۹ء میں اُن کا مقابلہ ڈاکٹر اے نیوے سے ہوا' جس نے اپنی "Picturisque Kashmir" نامی کتاب میں "کشمیری مکار' دغاباز' ظلم پرست، لات کے بھوت ہیں' وغیرہ جیسے توہین آمیز الفاظ لکھے تھے۔ "کیا کشمیری محنتی' مہمان نواز، نرم مزاج' شُکر گذار' فیاض' وفادار' اور نمک حلال نہیں ہیں؟" اُنہوں نے ڈاکٹر نیوے کو بتایا کہ یہ سب کچھ ثابت کرنے کے لئے تاریخ کشمیر سے بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی

ہیں۔ اُنہوں نے اس صدی کی دوسری دہائی کی شروعات میں ٹنڈل بسکو کے کشمیریوں سے متعلق تضحیک آمیز الفاظ پر، جو اُس نے اپنی کتاب "کشمیر۔ دھوپ اور چھاؤں میں" (Kashmir in sunlight and shade) لکھے تھے پُر زور احتجاج کیا' جس کے نتیجہ میں اُسے کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں یہ سبھی الفاظ حذف کرنا پڑے۔ اُنہیں تاہم اس بات کا یقین تھا کہ تعلیم کے پھیلاؤ کے ساتھ کشمیریوں کے ساتھ روا رکھا گیا رویہ خود بخود ختم ہو جائے گا اور آئندہ ایسے رکیک حملے بند کیے جائیں گے۔ اسی لئے انہوں نے سرکاری اور غیر سرکاری سرگرمیوں میں کافی دلچسپی لی' جنکا مقصد لوگوں کو نئی تعلیم کے نور سے مزین کرنا تھا۔ اُنہیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی تھی کہ کالجوں سے فارغ التحصیل ہونے والے طلباء کی تعداد ہر سال بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اُن کے اعزاز میں استقبالیہ جلسے منعقد کر کے وہ اپنی بے انتہا مسرت و شادمانی کا اظہار کرتے تھے۔

کشمیری تہذیب و تواریخ کے مطالعہ نے اُن کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ وہ فرصت کے اوقات میں اس میدان میں تحقیقی کام کیا کرتے تھے۔ اُن کی اس ضمن میں سب سے گرانقدر دین اُن پچاس بادشاہوں کے بارے میں تحقیقی کام تھا جن کا ذکر کلہن سے تشنہ تکمیل رہ چکا تھا۔ حسن کھویہامی، جس نے رتنا کر پُران کا ترجمہ حاصل کیا تھا کو بنیاد بنا کر اُنہوں نے اپنا مضمون لکھا جس میں انہوں نے تاریخی مواد پر تنقیدی نظر ڈالی۔ یہ مضمون رائیل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے رسالہ میں ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ لارڈ میکائیل نے جو اُس وقت مغربی بنگال کا گورنر تھا' اسے تاریخی تحقیق میں ایک بے مثال کارنامہ قرار دیا۔ ۱۹۰۹ء میں انہوں نے ایک اور مضمون لکھا جو شوپیان کشمیر کے کپل موچن تیرتھ کے آثار کے بارے میں تھا جہاں انہوں نے اٹھارویں صدی کا شاردا میں لکھا ہوا کتبہ دریافت کیا تھا جس سے اُس وقت کی عوامی زندگی پر روشنی پڑتی تھی۔ اس مقالہ کو بھی

گرانقدر تحقیقی کاوش سے تعبیر کر کے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالہ میں شائع کیا گیا۔ اسی دوران وہ اپنی ایک اور تالیف "جموں و کشمیر کا جغرافیہ" پر کام کر رہے تھے جو بعد میں ۱۹۱۳ء میں چھپی۔ اس کتاب کی ضرورت وادی میں آنے والی سیاحوں کی بھاری تعداد محسوس کرتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ یورپی سیاحوں کی مختلف کتابیں اس ضمن میں رہنمائی کرتی تھیں لیکن ان میں ایسے غلط بیانات اور جگہوں کے نام غلط طور درج کئے گئے تھے کہ اس سے وادی اور اس کے لوگوں کی ایک بگڑی ہوئی اور مسخ شدہ تصویر پیش ہوتی تھی۔ پنڈت آنند کول بامزئی کا جغرافیہ اپنی قسم کی اس موضوع پر پہلی لکھی گئی کتاب تھی جو انگریزی میں تھی اور اسی سرزمین کے فرزند نے تحریر کی تھی۔ اس لحاظ سے وہ زیادہ مستند تھی۔

ایسے ہی تحقیقی کام سے منسلکہ میدان میں مطالعہ کی صورت میں رہ نوردی کرتے ہوئے اُنہوں نے یہاں کی تین بنیادی اور اہم صنعتوں شالبافی، قالین بافی اور پیپر ماشی پر عالمانہ اور تحقیقی مقالات لکھے جن میں ان صنعتوں کے آغاز ان کے لئے درکار ہنر مندی اور ان کے مستقبل کے بارے میں کھُل کر بحث کی گئی تھی۔ یہ مقالے "ایسٹ اینڈ ویسٹ (شرق و غرب) نامی انگریزی رسالے میں اشاعت پذیر ہوئے۔ ان کی اشاعت ان صنعتوں کے بارے میں ملک اور ملک سے باہر کافی دلچسپی پیدا ہوئی۔ کئی محترم قارئین کی طرف سے اُن کو توصیفی اور تعریفی خطوط بھی موصول ہوئے۔

ایک اور موضوع اُن کے لئے جو باعث کشش تھا، وہ تھا چودھویں صدی کی شیو یوگنی للہ ایشوری کی تعلیمات اور اس کی زندگی کا تفصیلی مطالعہ۔ للہ دید پر اُن کا لکھا ہوا تذکرہ Indian Antiquary میں ۱۹۲۱ء میں چھپا۔ سر رچرڈ ٹمپل نے، جو اس رسالہ کا ایڈیٹر تھا اور جو خود بھی اس موضوع سے دلچسپی رکھ کر ایسی کوششوں کو مستحسن

قرار دیا۔ اُس نے بامزئی کے لل دید سے متعلق اس مقالہ سے کافی استفادہ کیا ہے اور اپنی کتاب "The word of Lalla" میں جابجا اس کے حوالے دیئے ہیں۔

پنڈت آنند کول بامزئی کی "کشمیری پنڈت" نام کی ایک اور کتاب ۱۹۲۴ء میں چھپی۔ یہ اس مختصر ذات برادری کا علمِ انسانی کی رُو سے کیا گیا مطالعہ ہے جس نے فنون، ادب کے علاوہ ہندوستان کو فلسفہ کے میدان میں بہت کچھ دیا ہے اور جس نے ممتاز ایڈمنسٹریٹر، عدلیہ اور سیاست کی برگزیدہ ہستیاں پیدا کی ہیں۔

مُلازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انہوں نے اپنا تمام تر وقت اور اپنی ساری قوت ادب کے مطالعہ کے لئے صرف کی جس کا ثمرہ اس موضوع پر اُن کی کئی عالمانہ کتابیں اور کتابچے ہیں جو اَپنے موضوعات پر مستند اور معتبر بھی ہیں۔ اُنہوں نے کشمیر کے آثار قدیمہ کا مطالعہ کیا اور بذاتِ خود جگہ جگہ گئے تاکہ موقعہ پر جا کر بُنیادی تفصیلات شامل ہونے سے نہ رہ جائیں۔ یہ کوششیں بھی بارآور ثابت ہوئیں اور کشمیر کے آثارِ قدیمہ سے متعلق کتاب "Arch ‌eological Remains in Kashmir" تیار ہو کے چھَپ گئی۔ یہاں کے آثارِ قدیمہ کے علاوہ اس میں کشمیر کے مغل باغات کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ سر تیج بہادر سپرو نے اس کتاب کا مقدمہ لکھا اور وی۔ این۔ مہتا (آئی۔ سی۔ ایس) نے کشمیر میں باغوں کی تاریخ سے متعلق ایک تعارفی مضمون اس کے ساتھ شامل کر کے اس کتاب کی اہمیت کو اُجاگر کیا۔

وہ لل ایشوری کی تعلیمات پر بھی اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھے۔ اُن کے کئی مضامین Indian Antiquary نامی رسالہ میں شائع ہوتے رہے جو بعد میں جمع کر کے "لل یوگیشوری" نامی کتاب میں ۱۹۳۹ء میں شائع کئے گئے۔ اس کتاب کی تقریظ راجہ نریندر ناتھ نے تحریر کی ہے۔

اُنہیں محسوس ہوا کہ لل دید کا مطالعہ تب تک ادھورا ہے جب تک کہ اُس کے معاصر حضرت شیخ العالمؒ عرف نُند ریشیؒ جو یہاں کی ریشیت کے بانی کار ہیں' کی تعلیمات اور زندگی پر بھی نہ لکھا جائے۔ انہوں نے ریشی ناموں اور نور ناموں کے نادر قلمی نسخے اِدھر اُدھر سے حاصل کئے جن کی بنیاد پر انہوں نے حضرت شیخ العالمؒ عرف نند ریشیؒ کی زندگی پر Life Sketch of Nund Rishi کے نام سے ایک مقالہ لکھا۔ اس کی تیاری میں انہوں نے ساری وادی میں گھوم پھر کر تحقیقی کام کیا۔ یہ مقالہ Indian Antiquary میں چھپا۔ بعد اُزاں اُن کے اقوال بھی اِسی رسالہ میں Wise -Sayings عنوان کے تحت زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئے۔ یہ پہلا موقعہ تھا جب حضرت شیخ کی زندگی اور اُن کے کارناموں کو ہندوستان اور ہندوستان سے باہر انگریزی دان طبقہ سے متعارف کرایا گیا۔ کام کا یہ سلسلہ لگن سے جاری رکھتے ہوئے پنڈت آنند کول بامزئی نے رُپا بھوانی اور اُن کی زندگی کے بارے میں بھی لکھا۔ یہ وہی خدا ترس خاتون ہے جس نے سترھویں صدی سے کشمیری پنڈتوں کے نہ صرف مذہبی بلکہ سماجی زاویہ نظر کو بھی متاثر کیا۔ پنڈت آنند کول بامزئی نے اس امر کی طرف بھی واضح اشارے کئے ہیں کہ وہ کس طرح اپنے ہم عصر مُسلم صوفی شاہ صادق قلندر سے متاثر ہوئی۔ انہوں نے دُوا[۲] ور مشہور صوفیوں' ریشی پیر (سترھویں صدی عیسوی) اور منہ سسوی راجنکا (اٹھارویں صدی عیسوی) پر بھی تحقیقی مضامین لکھے۔ کالیداس کی جنم بھومی پر اُنکا مضمون ہندوستانی تاریخ کے رسالہ Jaurnal of Indian History میں اشاعت پذیر ہوا۔

ڈاکٹر شوتوش مِترا نے اُن کی زندگی پر کافی، اثر ڈالا۔ کشمیر کے اس عظیم مُحسن کے بارے میں اُن کے دل میں کتنی محبت وعقیدت تھی اس کا ثبوت اُن کے تحریر کردہ

کتابچے' ڈاکٹر مترا۔ زندگی اور کارنامے' سے نمایاں ہے جو اُنہوں نے اُن کی موت کے بارہ سال بعد لکھی۔

پنڈت آنند کول بامزئی کو کشمیری زبان وادب سے کافی لگاؤ تھا۔ اُنہیں افسوس تھا کہ انگریزی اور اُردو کی ترویج کے ساتھ ساتھ کشمیری اپنی مادری زبان سے بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ انہوں نے کشمیری ضرب الامثال' اقوال اور پہیلیاں جمع کیں جو سلسلہ وار Indian Antiqnary رسالہ میں چھپیں۔ رسالہ کا اُس وقت کا ایڈیٹر مسٹر اولدھم خود بھی لسانیات کا ماہر تھا۔ کشمیری ضرب الامثال' اقوال اور پہیلیوں میں مضمر اجتماعی دانش مندی اور معانی کے انمول موتیوں کی داد دیتے ہوئے وہ پنڈت بامزئی کے نام اپنے خطوط میں لکھتا ہے کہ دُنیا میں مشکل ہی سے کوئی ایسی زبان ملیگی جو اس طرح پُر کار اور پُر معنی اور بے بہا دولت سے مالا مال ہوگی۔ دیوندر ستیارتھی ۱۹۳۴ء میں رابندر ناتھ ٹیگور کا تعارفی خط لیکر اُن سے ملنے آیا اور کشمیری لوک گیت جمع کرنے کے سلسلے میں تعاون کی درخواست کی۔ پنڈت آنند کول بامزئی نے نہ صرف اس کے لئے کئی کشمیری لوگ گیتوں کا ترجمہ کیا بلکہ اس سے کئی سر برآوردہ کشمیری شعراء کا تعارف بھی کرایا جن میں پیرزادہ۔۔۔ مہجور سر فہرست تھے۔ ماڈرن ریویو رسالہ میں مہجور کے بارے میں پنڈت آنند کول بامزئی کا ایک مضمون چھپا جس سے گورودیو ٹیگور متاثر ہوئے۔

پنڈت آنند کول بامزئی کا حلقۂ احباب بڑا وسیع تھا جس میں سنسکرت' فارسی اور کشمیری کے شعراء، ادیب اور عالم شامل تھے۔ اُن کی نشست گاہ کو کشمیر کی کلچرل اکادمی کی حیثیت حاصل تھی۔ کشمیر آتے وقت ہندوستان کی ممتاز شخصیتوں کی خاطر تواضع کرنا اُن کا معمول تھا۔ اُنہیں سوامی وویکا نند کو اپنے دولت خانہ پر عشائیہ دینے کی سعادت حاصل تھی۔ اسی موقعہ پر سوامی وویکا نند نے مختصراً ایک تقریر کی کہ کس طرح ہندوستان دُنیا

کا مذہبی اور تہذیبی پیشرو ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور ۱۹۱۵ء میں کشمیر آئے اور پنڈت آنند کول بامزئی نے اُن کے اعزاز میں عشائیہ دیا جس میں شرکت کے لئے کشمیر کی سبھی اَدبی شخصیات کو دعوت دی گئی تھی۔

سر تیج بہادُر سپرو جب سرینگر آئے تو اُن کے اعزاز میں بھی پنڈت آنند کول بامزئی نے اپنی قیام گاہ پر ضیافت کا اہتمام کیا، جس میں تعلیم یافتہ کشمیری نوجوانوں نے شرکت کی۔ تیج بہادر سپرو نے اُن کے اُمید وبیم سے بھرے خیالات بھی غور سے سُنے۔ انہوں نے سر دوراب' اور لیڈی ٹاٹا کا ان نوجوانوں سے ملاقات کا بندوبست کروایا تاکہ اُنہیں یہ بات ذہن نشین کرائی جائے کہ وہ کس طرح آزاد ہندوستان کی تجارتی اور صنعتی ترقی میں اپنا اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔

کشمیر' کشمیری زبان' ادب اور تہذیب کے مختلف پہلوؤں پر لکھنے والے علماء، ادباء، شعرأ اور تاریخ شناس جن سے پنڈت آنند کول بامزئی کے دوستانہ تعلقات تھے اُن میں سر جارج گریرسن، سر آرل سٹائن، سر رچرڈ ٹمپل' سی۔ ای۔ اے ڈبلیو' اولدھم، ڈاکٹر جی۔ ایم۔ ڈی صوفی' وی۔ سی۔ سکاٹ' او۔ کونور' ڈاکٹر پانڈے' دیویندر ستیارتھی' ڈاکٹر سچد انند سنہا' ڈاکٹر پچھمی دھر کلا' پنڈت شو نارائن شمیم محمد الدین فوق، مولوی محمد شاہ صادق' راجہ نریندر ناتھ' پنڈت ہر گوپال کول' پنڈت گوپی ناتھ آف اخبارِ عام' غلام احمد مہجور' عبدالاحد آزاد' اور کئی دوسری نادرِ روزگار شخصیات کے نام بطور خاص لئے جا سکتے ہیں۔

وہ کئی ادبی' سماجی اور تمدّنی تنظیموں کے بانیوں میں سے تھے۔ آخری دم تک ان تھک کام کرتے رہے اور مختصر علالت کے بعد ۱۱ر جولائی ۱۹۴۱ء کو پرلوک پدھارے۔

.... انگریزی سے ترجمہ۔ مترجم: سیّد رسول پونپر

............OOO............

پروفیسر قدوس جاوید

شاہ ہمدانؒ کی شاعری کا تعمیری کردار

("چہل اسرار" کی روشنی میں)

اپنی جڑوں سے مضبوط، معاشرہ ثقافت اور شعریات کے اندر پروان چڑھنے والی زبان کی شاعری بھی اتنی زندہ زرخیز اور پُر امکان ہوتی ہے کہ خواہ کسی بھی معاشرہ اور ثقافت میں کیوں نہ چلی جائے جذب و انجذاب اور تغیر و تبدل کے مراحل سے گذرتے ہوئے مقامی معاشرہ اور ثقافت میں بھی جدت طرازیوں کے گُل بوٹے کِھلاتی ہی رہتی ہے۔ کشمیر میں فارسی شاعری کے آغاز و ارتقاء اور مزاج و معیار کا مطالعہ فارسی شاعری کی اس غیر معمولی قوت کے حوالے سے ہی کیا جا سکتا ہے۔

ہم گریرسن کے اس قول سے کہ "برِ عظیم کی تمام جدید زبانیں اُپ بھرنش ہی کے بچے ہیں۔" انکار نہیں کرتے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار کیا جا سکتا کہ ان میں سے اکثر بچوں کو لسانی، صنفی، شعری اور فکری اعتبار سے اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے چلنے اور دوڑنے کا حوصلہ فارسی زبان اور شاعری نے ہی بخشا ہے۔ کہیں براہِ راست اپنی گود میں لے کر تو کہیں سب ہندی کے توسط سے طور پر وہ شے جسے لسانی و شعری تہذیب (CULTUROLOGY) کہتے ہیں اور جس کے عناصرِ ترکیبی لطافت و نزاکت

، فصاحت و بلاغت اور سوز و گداز وغیرہ صفات شامل ہیں اکثر جدید زبانوں کو فارسی زبان اور شاعری ہی کی دین ہے۔ کمال یہ ہے کہ فارسی زبان اور شاعری نے یہ کارنامہ ہر جگہ مقامی معاشرتی اور ثقافتی تشخص کا احترام کرتے ہوئے انجام دیا ہے۔ ہاں، مقامی رنگ پر اسلامی رنگ کا غالب آ جانا بھی ایک سچائی ہے لیکن اس کی داستان طویل ہے ویسے تاریخ کے حوالے سے اتنی بات تو سبھی جانتے ہیں کہ مسلمانوں کی ہند آمد سے قبل ہی اپنی ہزار سالہ تاریخ کے ساتھ فارسی زبان اور شاعری بعض تحفظات اور مستثنیات کے باوجود اسلامی ثقافت اور شعریات کے اثر و نفوذ سے سرشار ہو چکی تھی بلکہ تقلیب و تطہیر کے مرحلوں سے گزر کر اپنی شعریات کو اِس سانچے میں ڈھال چکی تھی جسے اسلامی شعریات کہتے ہیں۔ ہاں ہندوستانی بُت پرست معاشرت ثقافت اور شعریات پر فارسی زبان اور شاعری کے حوالے سے اسلامی رنگ کیسے غالب آتا گیا یہ مطالعے کا ایک الگ موضوع ہے۔ پھر بھی مختصراً چند تاریخی نکات از سرِ نو روشن کرتے چلیں تو مضائقہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اِن نکات کا تعلق بہر حال کشمیر میں فارسی زبان اور شاعری کے آغاز و ارتقاء اور شاہِ ہمدان کی شاعری کے مزاج و معیار سے بھی ہے مثلاً ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کی فتح سندھ و ملتان اور پنجاب سے لے کر شمال میں میرٹھ دہلی اور نواح دہلی کے علاقوں پر محمود اسف اٰل محمود کے تسلط اور پھر بابر کی فتحِ ہند تک کا زمانہ تقریباً ۸۰۰ سال کو محیط ہے۔ اس عرصہ میں شمالی ہندوستان کے ایک بڑے علاقہ پر اسلامی معاشرت اور ثقافت کے ساتھ ساتھ فارسی زبان اور شاعری کا غلبہ قائم ہو چکا تھا۔ اِسی دوران امیرِ کبیر شاہِ ہمدان کی پیدائش ۱۳۱۲ء سے دو سال قبل ۱۳۱۰ء میں سلطان علاء الدّین خلجی کا لشکرِ جرار دکن اور مالوہ کے خشک و تر کو زیر و زبر کرتا ہوا کم و بیش پورے جنوب پر نہ صرف قابض ہو چکا تھا بلکہ بنیادی طور پر فارسی کے ہی توسط سے یہ پورا علاقہ اسلامی معاشرت

اور ثقافت اور شعریات کے نُور سے منور بھی ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس عرصہ میں شمالی و جنوبی ہند کے دوسرے علاقوں کی طرح وادی کشمیر میں بھی اسلام کی روح پرور ہوائیں چلنے لگی تھیں یشاہ ہمدان کی کشمیر آمد سے چند سال قبل ہی ترکستان کے سیدزادے، شیخ شہاب الدّین سہروردی کے شاگرد حضرت بلبل شاہ کے ہاتھوں رینچن شاہ کے مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد کشمیر میں نہ صرف مسلم حکومت قائم ہوتی ہے بلکہ معاشرتی، ثقافتی اور لسانی نظام میں بھی اسلامی عناصر کا غلبہ دن بہ دن بڑھتا جاتا ہے۔ خاص طور پر نظم و نسق میں مسلمانوں کی شمولیت اور سرکار دربار اور بازار میں سنسکرت کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کی حصہ داری سے ہر سطح پر اسلام کے برکات و فیوض کے عام ہونے کی شروعات ہوتی ہے۔ چنانچہ بقولِ منور مسعودی ۱۳۴۰ء میں شہمیری دور کے سلطان شہاب الدّین کے عہد حکومت میں جب پہلی بار کشمیر میں سید امیر کبیر کا ورودِ مسعود ہوتا ہے تو اس وقت تک اسلام، اسلامی معاشرت، ثقافت اور فارسی زبان و شاعری کے لئے اِس ایران صغیر وادی کشمیر کی زمین ہموار ہو چکی تھی۔ گریرسن کے "دی امپیریل گزیٹر آف انڈیا" اور ڈاکٹر تارا چند کے "تمدنِ ہند پر اسلامی اثرات" سے لے کر جمیل جالبی کی تاریخِ ادبِ اردو تک متعدد تصنیفات میں بار بار کہا گیا ہے کہ چودھویں صدی کے وسط تک آ کر جبکہ امیر کبیر شاہ ہمدان کی کشمیر آمد ہوتی ہے...... برِ اعظم کے ایک بڑے علاقے میں فارسی زبان طبقہ شرفا کی کم و بیش لنگوا فرینکا بن چکی تھی اور دوسرے طبقوں کی زبانیں اور بولیاں بھی فارسی کے لِسانی نظام کے قریب آنے لگی تھیں اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ سندھ، پنجاب، ملتان، دکن، گجرات، راجپوتانہ، مہاراشٹر اور دلی اور نواحِ دِلی سے لیکر کشمیر تک بنیادی طور اور فارسی سے متاثر زبانوں ہی کے توسط سے اسلامی معاشرت اور ثقافتی کا آفتاب تازہ بڑے کروفر سے اُجالے بکھیرتا رہتا ہے۔ اس اعتبار سے برِ عظیم میں فارسی زبان اور

شاعری کے آغاز وارتقاء کی داستان اِس خطہ میں دینِ اسلام کی توسیع و اشاعت کی بھی داستان ہے اور شاہ ہمدان اِس داستان کا روشن باب ہیں یوں تو شاہ ہمدان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ داعیٔ اسلام تھے اور ان کی شعری ونثری سرگرمیوں کی غرض وغایت بھی دینِ اسلام کی تبلیغ واشاعت ہی ہے۔ پروفیسر غلام رسول ملک نے "چہل اسرار۔غزلیاتِ شاہ ہمدانؒ" مرتبہٗ پروفیسر منور مسعودی کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ

> "......نظم ونثر میں ان کی کِلک گوہر بار سے جو کچھ صادر ہوا ہے وہ بھی ان کی داعیانہ حیثیت کا ایک پَرتَو ہے اور اسکی مناسب تفہیم اور تعیّنِ قدر کے لئے اس بات کا ذہن نشین رہنا بہت ضروری ہے بالفاظ دیگر انکی شاعری تبلیغی یا دینی شاعری ہے اور اسے اِسی حیثیت سے پَرکھا جانا چاہیے۔"

شاہؒ ہمدان کی شاعری۔ بحیثیت مجموعی دینی اور تبلیغی شاعری ہے یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ لیکن شاہ ہمدان کی شاعری اگر فارسی، خصوصاً فارسی۔غزل کی شعریات کے حوالے سے بطور شاعری پڑھی......اور قبول کی جائے تو معلوم ہوگا کہ شاہ ہمدان کی شاعری صرف اور محض اِس وجہ سے بڑی شاعری نہیں ہے کہ اس کا سرچشمہ دین اور مقصد تبلیغ ہے۔ بلکہ اس وجہ سے بھی بڑی شاعری ہے کہ شاہ ہمدان نے اپنی غزلوں میں لسانی وشعری اور فنی وجمالیاتی مضمرات کو اس غیر معمولی شاعرانہ مہارت کے ساتھ برتا ہے جو مہارت کسی بھی شاعری کو بڑی شاعری بناتی ہے۔اس کا اندازہ شاہ ہمدان کے درج ذیل اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔

۱۔ گر ہما می قاف بال ہمت بر گشا
در فضائی لامکان باقدسیان انبار شو

غزل ۵۔ شعر ۸۔ اگر تم کوہ قاف کے عنقا ہو تو ہمت کے پر کھول دو اور لامکان کی فضاؤں میں پرواز کر کے فرشتوں کے ہمراہی بن جاؤ۔

۲۔ چو در دریائے وحدت گم نہ گشتی
از انت دُرِ عرفاں در شکم نیست

غزل ۲۔ شعر ۷۔ چونکہ تم نے دریائے وحدت کی غواصی نہیں کی ہے اس لئے تمہارے وجود کے اندر عرفان وادراک کے موتی نہیں ہیں۔

۳۔ گر آتشِ فراقش با صبر یار بودی
اندوہ اشتیاقش در دیدہ خار بودی

غزل ۶۔ شعر ۱۔ اے کاش کہ معشوقہ سے جدائی کی آگ کیساتھ ساتھ دیدارِ یار کے لئے صبر کی طاقت بھی ملی ہوتی اور شوقِ دیدار کا کرب آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا۔

یوں جمالش را نظر خورشیدِ تاباں میکند
آفتاب از رشک حسنش رومی پنہاں میکند

غزل ۱۶۔ شعر ۱۔ چمکتا ہوا سورج بھی جب اس کے حسن و جمال کو دیکھتا ہے تو وہ بھی رشکِ حسن سے اپنا چہرہ چھپا لیتا ہے۔

یاد رہے کہ چہل اسرار کی غزلیں، معجزاتی طور پر ہی سہی، چودھویں صدی کے اُخیر میں وجود میں آتی ہیں۔ لہذا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ شاہ ہمدان کی غزلوں میں بھی انہیں فنی اور جمالیاتی اقدار کو برتا گیا ہے جن کا رواج اس دور تک کی غزلوں میں ملتا ہے مثلاً:

۱۔ شاہ ہمدان کی غزلوں میں بھی مطلع و مقطع کا اہتمام ملتا ہے۔ بعض غزلوں میں حُسنِ مطلع کے طور پر بھی اشعار لائے گئے ہیں۔

۲۔ شاہ ہمدان کے مقطعے کے اشعار میں بطورِ تخلص کہیں علائی اور کہیں علی لایا گیا ہے۔

۳۔ شاہ ہمدان کی زیادہ تر غزلیں چھوٹی رواں بحروں میں ہیں جس سے قاری کو شعر کی قرأت میں اور معنی کو نغمہ سنجی میں آسانی ہوتی ہے۔

۴۔ شاہ ہمدان کی غزلوں میں عام طور پر ترنم خیز ردیف وقوافی کا استعمال ہوا ہے جن سے قرأت کے نتیجے میں غنائیت کا اخراج بلا روک ٹوک فطری طور پر ہوتا ہے۔

۵۔ دیگر شعراء کی طرح شاہ ہمدان کی غزلوں میں بھی اشعار کی تعداد میں یکسانیت نہیں۔ غزل میں اشعار کی کم سے کم تعداد کسی نے تین، کسی نے پانچ بتائی ہے اور زیادہ سے زیادہ گیارہ سے پچیس تک بتائی گئی ہے۔ لیکن یہ سب مفروضات ہیں، غالب کے یہاں دو شعر کی غزلیں بھی ہیں اور تین شعر کی بھی۔ شاہ ہمدان کی اکثر غزلیں ۹۔۹ اشعار پر مشتمل ہیں۔ کم سے کم ۷ اشعار کی غزلیں بھی ہیں اور زیادہ سے زیادہ ۱۵/ اشعار کی غزلیں ملتی ہیں۔ اساتذہ کے یہاں غزل کے اشعار کی تعداد طاق رکھنے کی روایت رہی ہے لیکن اس کا کوئی منطقی جواز نہیں۔ شاہ ہمدان کی غزلوں میں بھی اشعار کی تعداد زیادہ تر طاق ہی ہے لیکن ۱۲/ اشعار غزلیں بھی ہیں۔

۶۔ شاہ ہمدان کی غزلوں میں بھی ہر شعر معنوی اعتبار سے آزاد حیثیت رکھتا ہے لیکن فکر کی متعین سمت اور شاعری کے طے شدہ مقصد کے سبب علامہ اقبال کی طرح شاہ ہمدان کے یہاں بھی اکثر اشعار میں معنوی ارتباط وارتقاء کی کیفیت ملتی ہے۔ اس لئے آج کی زبان میں شاہ ہمدان کی اکثر غزلوں میں بین المتونیت (Intertextuality) بھی ملتی ہے اور متن پر متن قائم کرنے کی مثالیں بھی۔

۷۔ شاہ ہمدان کی غزلوں کا اسلوب بنیادی طور پر استعاراتی ہے۔ ایسا اس لئے

ہے کہ شاہ ہمدان کو پتہ تھا کہ "غزل کی پہلی اور آخری پہچان اس کی داخلیت، غیر واقعیت اور بالواسطگی ہے اور غزل میں خارجی فکری اور نظریاتی خیالات و تجربات کو تشبیہہ و استعارہ کی مدد سے ہی بیان کیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے شاہ ہمدان کی غزلوں میں تشبیہہ استعارات کا ایک قابلِ قدر سرمایہ ملتا ہے۔

۸۔ غزل کثرت الفاظ کا نہیں کفایت الفاظ کا فن ہے اور بڑا شاعر وہ ہے جو شعر کی زمین یعنی بحر، وزن، ردیف و قافیہ کی اوقات ذہن میں رکھ کر کم سے کم الفاظ کے لسانی برتاو سے شعر میں معنی و مفہوم کے زیادہ سے زیادہ امکانات پیدا کرے۔ شاہ ہمدان کے اشعار میں معنی و مفہوم کی تخم ریزی Dissemination کا یہ عمل عمدہ صورتوں میں ملتا ہے۔

۹۔ شاہ ہمدان کی غزلوں کے متون بھی دو طرح کے ہیں ایک وہ جسے سبقی متن یا Readerly Text کہتے ہیں اور جو قاری کے ذوق اور معیار سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ایسے متون سے قاری وہی معنی و مفہوم اخذ کرتا ہے جو شاہ ہمدان، قاری تک پہنچانا چاہتے ہیں ۔ لیکن دوسری کے بعض متون ایسے ہیں ۔ جنہیں تخلیقی متون Writerly Text کہا گیا ہے۔ ایسے متون معنیاتی اور جمالیاتی امکانات کی ترسیل کیلئے منتخب قاری اور مخصوص قرأت کا تقاضہ کرتے ہیں۔ چہل اسرار کی غزل ۶، ۷، ۹ میں ایسے متون ملتے ہیں۔

۱۰۔ شاہِ ہمدان کی غزلوں میں اُرضیت زیادہ ہے۔ وہ حق و معرفت کی باتیں شاعرانہ صفت گری کے ساتھ کرتے ہیں۔ اکثر مبالغے سے بھی کام لیتے ہیں لیکن پھر بھی ان کے اشعار اِتنے پیچیدہ نہیں کہ فہم و فراست سے ماورا ہو جائیں۔

شاہ ہمدان کی غزلوں کے ان عمومی منفی اور شعری امتیازات کے ذکر کے بعد اگر

ان بنیادی خصائص کا جائزہ لیں۔ جن پر "چہل اسرار" کی عظمت اور معنویت کا انحصار ہے تو دو باتیں سب سے پہلے سامنے آئینگی۔ اول یہ کہ چہل اسرار کی شاعری اسلامی نظریہ جمال کی تابع شاعری ہے جو اسلامی معاشرت اور ثقافت کی تشکیل میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ دوئم یہ کہ ہر چند کہ چہل اسرار غزلیات کا مجموعہ ہے لیکن اس کی غزلیں اپنے فکری اور معنیاتی نظام کی بنا پر غزلیہ شاعری کے کلیدی عناصر یعنی حسن و عشق اور رندی و سرمستی کے رسمی اور اصطلاحی مفاہیم کو ترک کر کے شاہ ہمدان کی شاعری کو پاکیزہ مقدس اور تعمیری قلب ماہیت کی شاعری بناتی ہیں اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں اسلامی نظریۂ جمال کی رُو سے فن کی عظمت و علویت کے لئے فن میں اعلیٰ تعمیری مقصدیت کی موجودگی کو آرائشِ فن کے لوازمات کے برتاو پر فوقیت حاصل ہے۔ اگرچہ اعلیٰ تعمیری مقصدیت ہی حُسنِ اصلی ہے لیکن اِس حُسن کے فنی اِظہار کو حسین بنانے کے لئے ضروری ہے کہ فنی اور جمالیاتی تقاضوں کو بھی موزونی و کمال اور تناسب و اعتدال کے ساتھ برتا جائے۔ اس طرح کے تخلیقی روّیہ (Creative Attitude) کے سبب ہی فن میں بوقلمونی، موزونیت، جامعیت اور پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔

اسلامی نظریۂ جمال کا دوسرا پہلو "تخلیقی بالحق" یا "تخلقو ابا خلاق اللہ" ہے جس کے مطابق فن میں "تخیل و تصور" پر "تعقل و تفکر" کو ترجیح حاصل ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی نظریہ جمال کی رُو سے وہی فن یا شاعری اعلیٰ عمدہ شاعری ہے۔ جس میں تنظیم و تہذیب سے عاری بے مقصد اور خام جذبات و خیالات کے بجائے منظم، مہذب با مقصد اور تعمیری افکار و نظریات کا اظہار کیا گیا ہو۔ کیونکہ ایسی ہی شاعری نہ صرف یہ کہ صوری و معنوی اعتبار سے حسین و جمیل ہوتی ہے بلکہ انسان کو ظاہری اور باطنی، انفرادی اور اجتماعی ہر لحاظ سے حسن و خوبی کا پیکر بننے میں بھی ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ شاہ ہمدان کی

شاعری ایسی ہی شاعری کے زمرے میں آتی ہے۔ یادداشت کے لئے صرف دو اشعار سامنے رکھ سکتے ہیں۔

از ہوائی نفس گر یکرہ خلاصی باشدس

درھوائی لامکان لاف از ملک افزوں زند

غزل ۲۲۔شعر ۵۔ ہوائے نفس سے اگر دِل خلاصی حاصل کرلے تو لامکان کی خواہش میں وہ فرشتوں سے بھی بلند وبرتر ثابت ہوگا۔

تو کوئی دوست ہمی جوئی ونمید انی

کہ گر نظر بہ حقیقت کُنی تو آں کو بی

غزل۔۲۸۔شعر۔۲۔تم کوچہ یار کی تلاش میں ہواور نہیں جانتے کہ درحقیقت خود تمہی وہ کوچہ ہو یعنی انسان خود اُپنے اندر ہی خدا کی تلاش کرسکتا ہے۔

شاہ ہمدان نے ،طرح کے مضامین اپنی غزلوں میں بیان کئے ہیں اور غزل میں حسن وعشق اور آزاد روی کے ساتھ ہی تصوف بھی بنیادی موضوع رہا ہے۔ اور اسلامی تصوف میں سب سے زیادہ وقعت عشق حقیقی کو حاصل ہے لیکن بعض شعراء کے یہاں عشق حقیقی کو عشق مجازی کے پردے میں پیش کرنے کا جو رجحان ملتا ہے اسکے اپنے غیر اسلامی معاشرتی اور ثقافتی اسباب ہیں۔ شاہ ہمدان کی صوفیانہ شاعری کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اپنے چند ایک اشعار میں حقیقت کو مجاز کے سانچے میں ڈھال کو پیش تو کیا ہے لیکن اس طرح کہ مجاز کے آئینے میں حقیقت کا نظارہ کیا جاسکتا ہے مثلاً:

قبلہ دل آفتابِ روئے اوست — کعبہ جاں خاکِ راہ کوئے اوست

چوں زِ زلفش گشت عالم مشکبوئے — دوستی ایں وآں بر بوئی اوست

کفرودین ونوروظلمت درجہان — از رُخ ماہ وشب گیسوئی اوست

غزل ۔۲۔ شعر ۔۱،۲،۳۔ اس کا آفتاب کی طرح روشن چہرہ' قبلہ دل و جاں ہے.
اور اس کے کوچے کی گرد راہ کعبہ جان وایمان ہے۔
اس کی زلفوں کی خوشبو سے جب یہ سارا عالم معطر ہو گیا تو اسی خوشبو کے طفیل دنیا
ئے محبت واخوت وجود میں آئی اور
دنیا میں کفر و دین اور نور و ظلمت معشوق کے چاند سے چہرے اور سیاہ زلفوں کے
سبب ہی وجود میں آئے ہیں۔

دراصل بیرونِ ہند سے ہندوستان آنے والے صوفیا اور مشائخ مثلاً خواجہ معین الدین چشتی' خواجہ فرید الدین گنج شکر' حضرت نظام الدین اولیا' شیخ عبدالقادر گیلانی' خواجہ باقی باللہ اور شیخ احمد سرہندی وغیرہ نے الگ الگ علاقوں میں اسلام اور اسلامی تصوف کو اس کے حقیقی خط و خال میں برقرار رکھتے ہوئے اس کی توسیع و تبلیغ کی جو کوششیں کی تھیں کشمیر میں شاہ ہمدان کی شاعری بھی اسی کی ایک شکل ہے۔ اسلامی تصوف کی رُو سے قربِ الٰہی کا واحد ذریعہ عشق ہے اور وحدت الوجودی عقیدے کے مطابق عشق کی انتہا فنا فی اللہ ہے۔ شاہ ہمدان کی شاعری میں فنا فی اللہ کے حوالے سے کثرت سے اشعار ملتے ہیں۔ مثلاً :

اگر فانی شوی در بحرِ توحید
عیاں بینی کہ آنجا کیف وکم نیست

غزل ۔۴۔ شعر ۔۹۔ اگر تم توحید کے سمندر میں فنا ہو جاو تو بے قیل وقال تم پر
سب کچھ عیاں ہو جائے گا۔

قطرہ' بہ دریا شدہ' مطلق بجا شدہ بحرِ محیط' قید شدہ در حدود
غزل ۔ شعر ۔۷۔ قطرہ دریا میں مل گیا اور اس کی وجہ سے بحرِ محیط کی روانی ... ی

حدود میں تنقید ہوگئی۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے شاہ ہمدان کی شاعری غزلیات پر مشتمل ہے اور روایتی معنوں میں غزل کا بنیادی وصف تغزل ہے۔ عام تصوّر یہ رہا ہے کہ غزل میں تغزل مخصوص مضامین، مخصوص لب ولہجہ اور مخصوص زبان کے برتاؤ سے پیدا ہوتا ہے۔ مخصوص مضامین سے مراد حسن و عشق، حق و معرفت، تصوف و اخلاق، رندی و سرمستی اور سوز و غم کے مضامین کو رسمی اور اصطلاحی معنوں میں نہیں بلکہ پاکیزہ اور تعمیری معنوں میں برتا ہے۔ حافظؔ، سعدیؔ اور بیدلؔ سے لے کا اقبالؔ تک کے یہاں رندی و سرمستی کے مضامین کے بیان سے مخصوص الفاظ تراکیب اور اصطلاحات کے پاکیزہ اجتہادی معنوں میں استعمال کی مثالیں بھری پڑی ہیں۔ اسی طرح شاہ ہمدان نے بھی اپنی غزلوں میں ایسے الفاظ و تراکیب کو حق و معرفت کے مضامین بیان کرنے کے لئے استعمال کر کے تغزل کی ایک مقدس فضا پیدا کی ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے۔

چوں در ریاضِ اُنس شراب بقا چشید
خوش تیغ ترک بر رُخ دار الفنا زنند

غزل ۹۔ شعر۔ ۸۔ جب وہ گلستان محبت میں شراب بقا کا مزا چکھے ہیں تو وہ فرطِ مسرت کی تلوار کو دارالفنا سے ٹکراتے نظر آتے ہیں۔

بادہ غم نوش اگر خواہی رہائی زیں خمار
راہِ رندان گیر گر جوئی تو قرب آنجناب

غزل ۲۶۔ شعر۔ ۶۔ تم اگر مستی و خمارِ دنیا سے چھٹکارا چاہئے ہو تو اس کے غم کی شراب پیو اور اگر تم اس کی قربت کے خواہاں ہو تو رندوں کا طریقہ اختیار کرو۔

اسی طرح تغزل کی دوسری شرط یعنی نرم اور دھیمے لہجے کا استعمال بھی شاہ ہمدان کی

غزلوں میں کامیابی کے ساتھ ہوا ہے خواہ الفاظ سے حزنیہ تاثرات پیدا ہوئے ہوں یا نشاطیہ، بلکہ پاکیزہ اور تعمیری مضمون آفرینی کے لئے بھی جہاں حسن و عشق کے تصورات ایک حد تک رنگ مجاز میں پیش کئے ہیں وہاں یہ نرم لہجہ لطیف جذبہ کے ساتھ مل کر ایک دلکش رومانی فضا بھی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً یہ شعر:

بوئی ز زلف آنمہ بگذشت در دو عالم

ذرات کون از آن بوئی سرمست افتادند

غزل ۲۷۔ شعر۔۳۔ میرے محبوب کی زلف سے خوشبو کا ایک جھونکا دونوں عالم میں پھیل گیا جس سے کائنات کا ہر ذرّہ مدہوش ہو گیا ہے۔

مخصوص و منفرد زبان کا استعمال صرف تغزل نہیں بلکہ شاعرانہ عظمت و انفرادیت پیدا کرنے کے لئے بھی ضروری ہے۔ اسی لئے ہر بڑے شاعر کی طرح شاہ ہمدان کی شاعری میں بھی نادر افکار و خیالات کے اظہار کے لئے نئے الفاظ و تراکیب کی ایجاد و اختراع اور ان کے فنکارانہ لسانی برتاؤ کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ اسی لئے شاہ ہمدان کے دینی اور تعمیری افکار شاہ ہمدان کی شاعرانہ حدت سے پگھل کر شعری تجربہ کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں اور وہ حسن آہنگ پیدا کرتے ہیں جو شاہ ہمدان کی شاعری کو عظمت و انفرادیت بخشتے ہیں۔ چنانچہ شاہ ہمدان اپنے جذبہ و احساس، فکر و خیال اور شعری تجربہ کے اظہار کے حوالے سے نادر الفاظ و تراکیب کا قابل قدر سرمایہ بھی فراہم کرتے ہیں۔

مثلاً کوئے مفلسی، آب دیدہ، صید شاہین، زیور ذکر، سالک راہ وصل، قبلۂ دل، نرگس جادو، بحرِ توحید، دُرِّ عرفان، ہمائے قاف آتش فراق، اندوہ اشتیاق، روضۂ وصال ملامت گاہ عشاق، مصرِ دل، داغ ارادت، مستان جام شوق، تیر نیاز۔ نقاب غیر وغیرہ۔

ان الفاظ و تراکیب کی روشنی میں صرف شاہ ہمدان کی فکری نہج کا ہی نہیں

الفاظ کے لسانی برتاؤ اور اظہار کے تخلیقی روّیہ کا بھی بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے دراصل شعر میں تراکیب کے استعمال کے جتنے بھی فوائد بیان کئے گئے ہیں یعنی اختصار، جامعیت، بلاغت اور زور بیان وغیرہ وہ سارے شاعرانہ فوائد چہل اسرار کے اشعار میں بہ تمام وکمال سامنے آئے ہیں۔ اس ضمن میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ شاہ ہمدان کی اکثر غزلوں میں الفاظ وتراکیب کے نادر لسانی وشعری برتاؤ کے ذریعے صوتی آہنگ پیدا کرنے کی بھی حیرت انگیز مثالیں ملتی ہیں مثلاً چہل اسرار کی بیسویں غزل کے یہ اشعار دیکھئے۔

از کنارِ خویش می یابم دیادم بوی یار
زاں ہمی گیرم بہر دم خویشتن را در کنار
چوں کنارم را میانی نیست پیدا ھر زمان
درمیان خونِ دل جانم غمش را کرد کنار

غزل ۲۰۔ شعر۔ ۱،۲۔ میں اپنے محبوب کی رعنائیاں ہر وقت اپنے قریب پاتا ہوں اوراسی لئے میں اسکی جانب کھینچا چلا جاتا ہوں۔

میں ہر وقت اُسے (اپنے محبوب کو) اپنے قریب پاتا ہوں اسی لئے اُس سے جدائی کا غم میرے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہے۔

شاہ ہمدان کی بعض غزلوں (مثلاً غزل ۲، ۱۰ وغیرہ) میں مترنم ردیف وقوافی کیا التزام سے بھی غنائیت سے بھرپور صوتی آہنگ پیدا کرنے کا رجحان ملتا ہے۔ اس ضمن میں شاہ ہمدان نے قرآنی آیات' الفاظ وتراکیب کا ستعمال بھی بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ کیا ہے۔

غرض یہ کہ شاہ ہمدان کی غزلوں کے مجموعے چہل اسرار کے، لسانی وشعری، فنی و

فکری اور جمالیاتی اسرار کے اور بھی کئی پہلو ہیں جن پر گفتگو ہو سکتی ہے پھر بھی مندرجہ بالا سطور میں جن چند نکات سے بحث کی گئی ہے ان کی روشنی میں شاہ ہمدان کی شاعری خاک پائے رسول عربیؐ کی برکتوں سے سرفراز ہندوستان آنے والے ان بزرگان دین کی مسلسل اور اجتماعی سرگرمیوں کا ایک حصہ ہے جن کا مقصد بلند و بانگ پہاڑوں، لق و دق صحراؤں اور ناپیدا کنار دریاؤں پر مشتمل اِس برِ عظیم کو دینِ مصطفٰےؐ کے زیرِ سایہ لانا تھا۔

شاعری ذات کے اندرون میں ٹھاٹھیں مارتے ہوئے جذبہ و احساس، فکر و دانش کے فطری اور بے محابہ اظہار کا نام ہے تو پھر شاہ ہمدان کی غزل بھی اس معشوقِ حقیقی کے وصل کے ذوق و شوق میں سالک کے اضطراب، کسک اور تڑپ کے اظہار سے ہی عبارت ہے۔ لہٰذا صوفیانہ اور دینی و تبلیغی مزاج رکھنے کے باوجود شاہ ہمدان کی غزلیں تغزل کی مقدس فضا سے معمور ہیں اور فارسی اور اردو غزل کی شعریات کے جو بنیادی تعمیری امتیازات ہمارے عظیم شعراء کی غزلوں میں ملتے ہیں ان کا سلسلہ کہیں دور کہیں قریب سے شاہ ہمدان کی غزل کی شعریات سے ملتا ہے لہٰذا سچ تو یہ ہے کہ چودہویں پندرہویں صدی میں جبکہ دراوڑی اور آریائی تہذیبوں کے زیرِ اثر سنسکرت سے لے کر اپ بھرنشوں تک کی شاعری لذت پرستی کی دلدل میں ڈوب چکی تھیں اور برِ عظیم کی جدید زبانوں میں بھی کنگھی چوٹی بلکہ جنسی لذتیت سے بھرپور شاعری کا رواج عام ہو چکا تھا ایسے میں اگر مسعود اور سلمان، بابا فرید، شرف الدین یحیٰ منیری، بوعلی شاہ قلندر، بہاء الدین باجن اور قاضی محمود وغیرہ کے ساتھ ساتھ امیر کبیر شاہ ہمدان کی دینی، تبلیغی اور تعمیری شاعری سامنے نہ آئی ہوتی تو آج ہندوستانی معاشرت اور ثقافت میں اسلامی رنگ و بو کے اتنے اور ویسے نظارے بھی نہ ہوتے جتنے اور جیسے نظاروں کے درمیان ہم اور آپ جی رہے ہیں۔

نوشاد احمد کریمی

○

سکونِ قلب و نظر اَب کے کھونے والا ہے

شجر ستارہ نمودار ہونے والا ہے

جہاں ندی بھی لرز جائے خوفِ کشتی سے

وہ حادثہ بھی سَرِ آب ہونے والا ہے

سُلگ رہا ہے یہ احساس کیوں مرے اَندر

لہو کے اَشک کوئی جیسے رونے والا ہے

عجب نہیں کہ سفر چاند کا اَدھورا ہو

جو جاگتا تھا مسلسل وہ سونے والا ہے

کِھلا ہے شاخِ خزاں پر جو پھول خوابوں کا

لہو کی ڈور میں خوشبو پرونے والا ہے

نہ جانے کون سے جادو کا ہے اَثر اِس پر

وہ اَپنی آنکھ کا ہر خواب دھونے والا ہے

خبر نہیں تھی، جسے نا خدا سمجھتا رہا

بساطِ بخت مری وہ ڈبونے والا ہے

یہ دُھوپ چھاؤں کا موسم ہے خوشگوار، مگر

وصال و ہجر کا منظر بھی ُ سونے ُ والا ہے

زمانہ جس کو سمجھتا ہے کم سخن نوشاد

وہ ایک کوزے میں دریا سمونے والا ہے

☆☆☆

نوشاد احمد کریمی

○

وہ میرے قتل سے اِنکار کرنا چاہتا ہے

کرم مجھ پر بہت عیار کرنا چاہتا ہے

مجھے بھی عشق کا بیمار کرنا چاہتا ہے

مرا بربادؔ وہ گھر بار کرنا چاہتا ہے

حوالے سے مرے ہر سمت ہے پہچان جس کی

وہی مجھ کو پسِ دیوار کرنا چاہتا ہے

خیال و خواب کہ تہہ سے اُبھرتا ہے جو اِک چہرہ

وہی ہر خواب کو مسمار کرنا چاہتا ہے

سُلگتے ذہن میں جلتا ہُوا جذبوں کا پیکر

طلسمِ خواب سے بیدار کرنا چاہتا ہے

ہوائے دشت کا پالا ہُوا مسموم منظر

متاعِ یاس سے ہشیار کرنا چاہتا ہے

اسیرِ وصل ہوں پھر بھی ترا خاموش لہجہ

سکوتِ ہجر کا اظہار کرنا چاہتا ہے

صعوبت ہجر کی نوشادؔ وہ محسوس کر کے

وفا کا راستہ ہموار کرنا چاہتا ہے

●

نوشاد احمد کریمی

O

خواب کے شہر میں کیا ہے جو صبا لے جائے
چند مُرجھائے ہوئے گُل ہیں اُڑا لے جائے
کس نے مانگی ہیں دُعائیں کہ ہَوائے تازہ
ریت کے سارے گھروندوں کو اُٹھا لے جائے
ساحلِ عشق پہ میں سوچ کے آیا ہوں یہی
کوئی دریائے جنوں مجھ کو بہا لے جائے
زخم کی شمع سرِ طاقِ بدن ہے روشن
وادیٔ شوق سے اَب اور وہ کیا لے جائے
خاک چھانی ہے بہت شہرِ جنوں کی میں نے
جس کو جانا ہے وہاں مجھ سے پتا لے جائے
قتل گاہوں سے گزرنا ہے منظور مجھے
مجھ کو جانا ہے جہاں راہِ وفا لے جائے

●

نوشاد احمد کریمی

○

ہَوائے دشت کے نرغے میں ہو صبا روشن
خزاں کے سامنے کرنا ہے اِک دِیا روشن

سماعتوں پہ ہی پَردے پڑے رہے، ورنہ
فصیلِ لب پہ خموشی کی تھی صَدا روشن

شبِ سیہ میں چراغاں سے کچھ نہیں ہوگا
نظر کے لمس سے ہوتا ہے آئینہ روشن

شعاعِ خواب سے آنکھوں کو جب ملی تابش
گزشتہ یادوں کا دیکھا ہے سلسلا روشن

چراغِ عجز بہ دستِ خلوص جل نہ سکا
کہاں سے ہوتی فلک پر مری دُعا روشن

یزیدِ نو کے چراغوں کا جلنا بجھنا کیا
نہ ہوگی اِن سے کبھی خاکِ کربلا روشن

●

نصیر پرواز

رفاقتوں کی حسین ساعتیں کشادہ کر
کبھی کبھی مرے خوابوں سے استفادہ کر

اسی نے آندھیاں بھیجیں مرے تعاقب میں
کہا تھا جس نے سفر سارے پا پیادہ کر

میں گفتگو کے سبھی زاویئے سمجھتا ہوں
تکلفات ہٹا شغل طرز سادہ کر

تجھے عزیز سہی روشنی کی عریانی
رفو کبھی تو مگر خواہش لبادہ کر

نہیں ضروری ہر اک غم ملے پس امید
گناہ کوئی کسی روز بے ارادہ کر

یہ روز و شب کا سفر آخری پڑاؤ پہ ہے
خیال لمحہ حرماں ذرا زیادہ کر

وہ جس نے فرق بتایا تھا کفر و ایماں میں
پھر ایک بار اسی جرم کا اعادہ کر

یہ پیچ و خم یہ نشیب و فراز سب لازم
سفر ہے شرط اگر اعتبارِ جادہ کر

یہ راستے ہیں نہ جانے کہاں نکل جائیں
قدم اٹھانے سے پہلے کوئی ارادہ کر

پھر اس کے بعد بجھا دے سبھی تمنائیں
بس ایک رات مجھے دل کا شاہزادہ کر

جہاں جہاں ملیں پرواز بے زباں دریا
پئے خلوص وہاں ذکر کام وبادہ کر

نصیر پرواز

کبھی تو ابر کا ٹکڑا نوازشیں کرتا
سلگ رہی تھی اگر روح بارشیں کرتا

نصیب ہوتی اگر صحبتِ حاجت گل
کشادہ شہر و خاکی رہائشیں کرتا

بھلا کیا مجھے خوابوں پہ رکھ دیا شب نے
اگر میں جاگتا رہتا تو خواہشیں کرتا

بحال کرتا مجھے گل فشاں اجالوں پر
چراغ اپنی اگر آزمائشیں کرتا

بھٹک رہا تھا کہاں اپنی کھوج میں دریا
مری تہوں میں اترنے کی کاوشیں کرتا

ہر ایک آنکھ نے جھٹلا دیئے مرے سائے
میں اپنے غم کی کہاں تک نمائشیں کرتا

گلے نہ ہوتے زمانے سے اس قدر تجھ کو
اگر تو خود کو سمجھنے کی کوششیں کرتا

چھپا کے یوں تو نہ رکھنا تھی دشمنی اپنی
مرے خلاف مریضوں سے سازشیں کرتا

اسی لئے تو مندر کو قطرہ قطرہ جیا
کوئی تو تشنہ لبوں کی ستائشیں کرتا

جہاں چراغ جلانا بھی جرم تھا پرواز
دراز کون وہاں اپنی تابشیں کرتا

○

اِس طرح آنسوؤں سے بیاں ہوگئی
بات چھوٹی سی تھی داستاں ہوگئی
ایک جھونکا سبھی کچھ اُڑا لے گیا
ساری محنت مری رائیگاں ہوگئی
گھر وہی ہے مگر راستے اور ہیں
ایک دیوار سی دَرمیاں ہوگئی
وقت کی تیز رفتاریاں دیکھ لو
پھر بَہار آتے آتے خزاں ہوگئی
میں ستارے سجانے لگا تو زمیں
دیکھتے دیکھتے آسماں ہوگئی
چھپتی پھرتی ہے بلراؔج کس خوف سے
زندگی کیلئے بے نشاں ہوگئی

●

بلراج بخشی

ربط بڑھتا ہے آنے جانے سے — مل ہی جائیں کسی بہانے سے

ایک پل میں جہاں سے اُٹھ جائیں — یوں نہ اُٹھیں گے ہم اُٹھانے سے

بھولی بسری پڑی ہیں کچھ یادیں — اور کچھ زخم ہیں پُرانے سے

بارِ تردید ہو کہ بارِ ثبوت — ہے غرض ہم کو بوجھ اُٹھانے سے

روز کرتے ہیں اِس لئے ناراض — مان جاتا ہے وہ منانے سے

اِک روایت کے پاسبان ٹھہرے — ہم ہیں وابستہ اِک گھرانے سے

وہ ستمبر کی دلنشیں راتیں — یہ نومبر کے دن سہانے سے

دوستی کا بھرم رہے بلراج

ہم تو باز آئے آزمانے سے

●

بلراج بخشی

○

ٹھہر اَے گردشِ اَفلاک یہ کسی ڈگر آئی
دِلوں کے درمیاں اِک ارضِ فاصل سی نظر آئی

نہ جانے کیسا غم اَندر ہی اَندر کھائے جاتا ہے
اَچانک بے سبب ہی ہنستے ہنستے آنکھ بھر آئی

نہیں یوں ہی کوئی ٹوٹا ہوا روشن ستارہ تھا
گھڑی بھر کو لگا جیسے کوئی اُمید بر آئی

کسی کو بھولنے کی کوششوں میں عمر بھر روئے
کسی کی یاد میں جب آئی برنگِ چشمِ تر آئی

کوئی منزل نہیں رختِ سفر کچھ بھی نہ تھا بلراج
چلے جب بے اِرادہ ہم تو جیسی رہگذر آئی

●

بلراج بخشی

وہ چُپ رہا تو ہُوا اِس قدر ملال مجھے
کہ جاتے جاتے کئی دے گیا سوال مجھے

یہ سچ ہے آنہ سکا کسی کے کام مگر
کہاں رہاں کبھی اپنا ہی کچھ خیال مجھے

اُسی کو میری خموشی قبولِ جرم لگی
کبھی نہ کرنے دی جس نے عرضِ حال مجھے

کھُلی زمیں میں پھل پھُول جاؤں گا میں بھی
کسی بہانے سے گملے سے اَب نکال مجھے

میں ذرّے ذرّے میں تقسیم ہوتا جاتا ہوں
ہَوا چلی تو بکھر جاؤں سنبھال مجھے

تمام عمر یہی مشغلہ رہا اُس کا
عروج بخشا، دُنیا کبھی زوال مجھے

وہ میرا دوست ہے دُشمن ہے کیا یقین کروں
میں پات پات ہوں کرتا ہے ڈال ڈال مجھے

تو کیا ہُوا جو زمانہ مجھے مٹانے لگا
بنا رہا ہے وہ سب کیلئے مثال مجھے

تباہ لمحہ بہ لمحہ کچھ اُس رضا سے ہُوا
تلاش کرتے ہیں اَب بھی وہ ماہ و سال مجھے

نہ جانے کس کے خیالوں میں آؤں گا بلراج
نہ جانے کون کبھی دے گا خط و خال مجھے

ڈاکٹر جاوید راہی

اب کے مل جائیں کہیں ایسا بہانہ بھی نہیں
ویسے حالات نہیں ویسا زمانہ بھی نہیں

جانے کیوں سانپ حفاظت کے لیے بیٹھے ہیں
میری دیوار کے نیچے تو خزانہ بھی نہیں

دن جو لکھتا ہے اُسے رات مٹا سکتی ہے
یہ وہ جادو ہے جو ہم نے کبھی جانا بھی نہیں

چاند سورج میرے پہلو میں کھڑے رہتے ہیں
ان کی منزل بھی نہیں میرا ٹھکانہ بھی نہیں

اس کے حلقے میں کوئی اور بلا بس جائے
دل کا ویرانہ ابھی اتنا پرانا بھی نہیں

وہ جو کہتے ہیں کہ رشتوں کی حدیں ہوتی ہیں
میں بھی کہتا ہوں کہ میں اتنا دیوانہ بھی نہیں

علمدار حسین عدمؔ

ابنِ آدم منتشر ہوتا گیا
کیا تھا اور کیسا بشر ہوتا گیا

منزلیں اب تو نظر آتی نہیں
ایک اندھا راہ بر ہوتا گیا

ہم تو سمجھے عمر کافی ہے پڑی
وقت لیکن مختصر ہوتا گیا

کھا گئی دیمک درختوں کی زمیں
یہ شہرِ ادب بے ثمر ہوتا گیا

تشنہ لب گزرا کوئی ساحل کے پار
اور سمندر بے خبر ہوتا گیا

علمدار حسین عدمؔ

کبھی جب بات نکلی رُت جنوں کی
حقیقت کھل گئی اپنے جنوں کی

کہیں گھاٹا نہ ہو جائے ہمیں پھر
بڑھا دیتے ہیں قیمت آنسوؤں کی

نگلتے جارہے ہیں آسماں بھی
سجی ہے آج محفل اژدھوں کی

خبر، اخبار، پرچے اور رسالے
کہانی بولتے ہیں رہزنوں کی

میرا معیار خود بتلا رہا ہے
غزل میں نہیں بنتی فسوں کی

نورشاہ

دوسرا گھر

اُس گھر میں وہ سب کچھ تو نہ تھا جو ایک گھر میں ہونا چاہیے، پھر بھی وہ اُس کے لیے گھر تھا۔ اپنا گھر اور اُس گھر میں اُس کے والدین تھے، دو بڑی بہنیں تھیں، ایک چھوٹا بھائی تھا، زندگی کے دُکھ تھے، مجبوریاں اور محرومیاں تھیں۔ گھر میں جو ترتیب ہوتی ہے وہ کہیں نہ تھی۔ سرگوشیاں تو تھیں مگر درد میں ڈوبی ہوئیں، حرارت تو تھی مگر تھکی تھکی سی۔ وہ شاید اس لیے کہ گھر ہوتے ہوئے بھی وہ گھر نہ تھا بلکہ کرایہ پر لیا ہوا ایک چھوٹا سا مکان تھا جس میں اُن سب نے ایک گھر آباد کر رکھا تھا اور بچپن سے ہی اُس کے لاشعور میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ گھر بسانے اور سجانے کے لیے صرف اپنا مکان ہونا چاہیے۔ وہ ایک ٹیچر کے ہاں پیدا ہوا تھا جو حقیقی معنوں میں نیک دل اور فرشتہ سیرت تھا، ایماندار اور محنتی تھا۔ اپنی چھوٹی سی تنخواہ سے وہ آج تک اپنا مکان تعمیر نہ کر سکا تھا اور پھر دو تین سال بعد اُس کی تبدیلی ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں ہوتی رہتی تھی۔ اِس تبدیلی کے ساتھ ہی

اُسے مکان بھی تبدیل کرنا پڑتا اور ہر بار اپنا مختصر سا اثاثہ، مختصر سا سامان سمیٹنا پڑتا۔

اور اُس کے کچے ذہن میں یہ بات جم چکی تھی کہ دنیا میں وہی لوگ خوش نصیب ہیں جن کے اپنے مکان ہیں، اس وجہ سے احساسِ کمتری کی دھول اُس کے ذہن میں اپنا گھر بنا چکی تھی۔ اب آہستہ آہستہ اُس کا نابالغ ذہن بلوغت کی سرحدوں کو چھونے لگ گیا تھا۔ اِس دوران اُس نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا لیکن ماں فوت ہو چکی تھی اور باپ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو چکا تھا۔ اُس کی تھوڑی سی پنشن اب اُن سب کا آخری سہارا تھا...... اور اِس تھوڑی سی پنشن سے نہ تو مکان بن سکتا تھا اور نہ ہی خریدا جا سکتا تھا۔

اپنے باپ سے اجازت لے کر وہ نوکری کی تلاش میں شہر چلا آیا۔

اِس شہر میں وہ پہلی بار آیا تھا۔ یہاں کی ہر چیز اُس کے لیے نئی تھی۔ یہاں کا ماحول، یہاں کا رہن سہن اُس کے لیے نیا تھا۔ اس گہما گہمی نے اُسے اپنا آپ، اپنا وجود اجنبی سا لگ رہا تھا لیکن وہ ایک مقصد لے کر یہاں آیا تھا اور اِس مقصد کے حصول کے لیے اُس نے اپنے آپ کو اِس رنگ میں رنگنے کی کوششیں شروع کیں اور ایک دن بڑی جانفشانی کے بعد اُسے ایک پرائیوٹ کمپنی میں نوکری مل گئی۔ یہ ایک ٹرانسپورٹ کمپنی تھی، رہنے کے لیے ذراسی جگہ بھی مل گئی۔ پہلی تنخواہ ملی تو اُس نے ضروری اخراجات کے لیے کچھ پیسے رکھے، باقی بنک میں جمع کر دیے...... اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ وہ نہایت ایمانداری اور شرافت سے کام کرتا رہا۔ دراصل یہ ایمانداری

اور شرافت اُسے اپنے باپ سے ملی تھی ...... اور اس دوران وہ صرف ایک بار اپنے گھر گیا جب اُس کی دونوں بہنوں کی شادی تھی۔ پھر جب اُس کا باپ مر گیا وہ اُس کی زندگی کا تیسواں سال تھا۔ اُس نے جب یہ خبر سُنی تو خاموشی سے رو دیا لیکن دوسرے دن اپنے معمولات میں مصروف ہو گیا جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ اُس کی تنخواہ میں اضافہ ہوا تو اُس کی بچت میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ اب اُس کے پاس اتنی رقم جمع ہو چکی تھی کہ وہ اپنے مکان کے بارے میں سوچ سکے۔ بچپن سے جو خواب اُس کے ذہن، اُس کے دل میں پرورش پا رہا تھا، اُس کی تعبیر دیکھنے کے لیے وہ بے چین ہو رہا تھا۔

پہلے اُس نے بنے بنائے مکان کی تلاش کی۔ بہت سے مکان دیکھے بھی لیکن ہر مکان میں اُسے کسی نہ کسی کمی کا احساس ہوتا رہا۔ وہ جس مکان کی تلاش میں تھا، جس مکان کی تصویر اس کے ذہن میں پنپ رہی تھی وہ مکان اُسے کہیں بھی نہیں مل رہا تھا۔ پھر اُس نے سوچا، بہت سوچا اور اپنے من ہی من میں فیصلہ کر لیا کہ وہ مکان کی تعمیر کے لیے زمین کا پلاٹ خریدے گا اور اپنی مرضی، اپنے ڈھنگ اور اپنی پسند سے مکان بنوائے گا۔ اپنا مکان ...... اپنا گھر لیکن والدین تو اُسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ یہ دُنیا چھوڑ کر چلے گئے تھے اور اُس کی بہنیں شادی کے بعد اپنے گھر جا چکی تھیں۔ اُس کا چھوٹا بھائی ...... اُس کے بارے میں اُسے کوئی جانکاری نہ تھی، جانے وہ کہاں چلا گیا تھا کسی سے کچھ کہے بغیر ...... پھر وہ مکان بنائے گا تو کس کے لیے۔ کس خواب کی تعبیر کے لیے۔ اُس نے جو خواب دیکھا تھا ہو جاگنے سے پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا ...... پھر اُس کے ذہن میں ایک تصویر اُبھری، ایک لڑکی کی

تصویر جسے اُس نے کبھی نہ دیکھا تھا، جسے وہ کبھی نہ ملا تھا۔ وہ شرمائی شرمائی سی لڑکی، سمٹی سمٹی سی، گرم اور گلابی ہونٹوں والی لڑکی، نرم و ملائم بالوں والی لڑکی، چہرے پر بہار کی پہلی صبح کا اُجالا پن لیے اور پھر یہ ان دیکھی ان جانی لڑکی اُس کے سپنوں سے کھیلنے لگی۔ اپنے سپنوں کو سجانے کے لیے وہ ایک بار پھر زندگی کی سڑک پر دوڑنے لگا۔ اُس نے اپنے اخراجات میں کمی کر دی، اوور ٹائم کام کرنے لگا۔ کمپنی کا ہر فرد اُس کی سادگی، شرافت اور شائستگی کا قائل تو تھا لیکن اُس کے اندر کے درد، اُس کے پوشیدہ روگ سے کوئی واقف نہ تھا۔ اُس نے وہ پلاٹ بھی دیکھ لیا تھا جو وہ اَب خریدنا چاہتا تھا۔ پلاٹ کے مالک سے بات بھی ہو چکی تھی، قیمت بھی طے ہو چکی تھی لیکن اب بھی کچھ روپیوں کی کمی تھی اور اِس کمی کو پورا کرنے کے لیے اُسے دو سال اور انتظار کرنا پڑا...... اور جب رقم پوری ہوگئی تو اُسے بتایا گیا کہ وہ پلاٹ کب کا دس گنا زائد قیمت پر بِک چکا ہے۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا...... زندگی کو اپنی مرضی سے قید کرنا اُس کے بس کی بات نہ تھی۔

اور پھر ایک دن اُس نے بنک سے ساری رقم نکال دی اور ایک چھوٹا سا پلاٹ خرید لیا۔ اپنے مکان کے لیے، اپنے گھر کے لیے...... اپنے سپنے کے لیے۔ زندگی کی حسرتوں اور آرزوؤں کو اپنی مرضی سے قید کرنے کے لیے...... یہاں اُس نے پھولوں کی کیاریاں لگائیں، گلاب کے پھول اُگائے۔ وہ خوش تھا بے حد خوش کہ یہ پلاٹ اُس کا اپنا ہے، وہ اس کا مالک ہے۔ وہ دفتر سے سیدھا وہیں آتا اور شام اُترنے تک اُسی قبرستان میں بیٹھا رہتا جہاں اُس نے اپنی قبر کے لیے زمین خریدی تھی ......۔

☆☆☆

تحریر: انتون چیخوف
ترجمہ: رفیق شاہین

جی حضوری

صوبائی کاؤنسلر دولبونوسوف کسی کام سے پیٹرس برگ گئے ہوئے تھے کہ وہیں اُنہیں پرنس فنکالوف کے یہاں ایک ناچ گانے کی تقریب میں شریک ہونا پڑا وہاں سچیوتکن جیسے بے حیثیت شخص کو شرفاء کے ساتھ شریکِ بزم پا کر اُن کی حیرت آسمان کو چھُونے لگی۔ آج سے پانچ سال قبل سچیوتکن اُن کے بچوں کو ٹیوشن پڑھایا کرتا تھا۔ محفل میں واقف کاروں کی عدم موجودگی کے سبب اُنہوں نے سوچا چلئے سچیوپوتکن سے ہی ملاقات کئے لیتے ہیں۔ چنانچہ اس کے نزدیک پہنچ کر انہوں نے چونکتے ہوئے کہا:

''آپ؟......آپکا یہاں کیسے آنا ہوا؟

''جیسے کہ آپ کا آنا ہوا۔''

''واہ! یہ بھی کوئی بات ہوئی۔'' دولبوسونوف نے ناگواری سے اُسے نیچے سے اُوپر تک دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرے معاملات اور طور طریقے میرے ساتھ ہیں۔ خیر! اور سناؤ کیا حال،

چال ہیں......؟

'بس سو سو ہیں۔ میں نے یونیورسٹی سے گریجویشن کرلیا ہے اور اَب ایک خصوصی تنظیم کے سربراہ پودوکونیکوف کی ماتحتی میں بطور اُفسر کام کررہا ہوں۔"

"اچھا؟......اچھا ہے......اچھا ہے......کم از کم شروعات میں تو بُرا نہیں ہے ......غنیمت ہی ہے......لیکن معاف کیجئے گا سوال کی گستاخی کررہا ہوں......اِس سے آپ کو کیا مل جاتا ہے؟"

"یہی کوئی آٹھ سو روبل۔"

کیا؟......اُف! بس اِتنے ہی؟......اِن سے تو چائے پانی کا خرچ ہی نکل سکتا ہے۔"

دولبوسونوف نے تشویش کا اظہار کیا۔ پھر کرسی پر آگے کو جُھک کر انہوں نے بڑے مشفقانہ اور سرپرستانہ لہجے میں کہا۔

'پیترس برگ' جیسے مہنگے شہر میں اگرچہ عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے کیلئے یہ ناکافی ہیں پھر بھی شاید آپ خود بھی واقف ہوں کہ میں "اُگا رودیبو شکیر سکایا ریلویز" کے انتظامیہ کا سیکرٹری ہوں اور جانتے ہو اس کے عوض مجھے کیا ملتا ہے؟ پورے ڈیڑھ ہزار روبل' ملتے ہیں مجھے۔"

اتنا کہ دولبوسونوف کی چھاتی فخر سے تن گئی اور چہرا سُرخ ہوکر خوشی سے دَمک اٹھا۔ اُنہوں نے مزید کہا۔

"عزیز نوجوان! ایسے ہی خیال آ گیا اِس لئے پوچھ لیتا ہوں۔"

"ہمارے اس محفل کے جلیل القدر میزبان سے آپکی ملاقات کیسے ہوئی؟"

ان کا تجسّس انہیں دیر سے مضطرب کئے ہوئے تھا۔

"بڑی آسانی سے۔" سچیو تکن نے بڑے بھولے سے منہ سے کہا۔

"ان سے میری ملاقات اسٹیٹ سیکرٹری لودکن کے یہاں ہوئی تھی۔"

"اسٹیٹ سیکرٹری!......اسٹیٹ سیکرٹری......لودکن؟ لودکن؟......

تو تمہاری ملاقات ہزایکسیلنسی لودکن کے ساتھ بھی ہے؟

حیرت واستعجاب کے مارے دولبوسونوف کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر نکلی پڑ رہی تھیں۔

"ان سے ملاقاتیں تو عام طور پر ہوتی ہی رہتی ہیں۔ وہ میرے پچیا سسر بھی تو ہیں۔ میری شادی اُن کی بھتیجی کے ساتھ ہوئی ہے۔"

'شادی؟......شادی؟......تمہاری شادی ہزہائینس کی بھتیجی سے......یعنی کہ تم اُن کے داماد ہو؟"

دولیوسونوف پر پے در پے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ وہ ہکلانے لگے تھے بدقت خود پر قابو حاصل کر کے انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔

"پوت کے پاؤں تو پالنے میں ہی نظر آجاتے ہیں۔ شاید تم نہیں جانتے کہ تمہارے ساتھ اپنی پہلی ملاقات میں تم پر پہلی نظر پڑتے ہی میں نے تمہیں پہچان لیا تھا۔ میں نے تو اُسی وقت پیشن گوئی کر دی تھی کہ تم ترقی کے آسمان پر آفتاب بن کر جگمگاؤ گے۔ یہ میرے حقیقی اور دلی جذبات ہیں یور ایکسیلینسی! میرے محسنِ اعظم حضور ایوان پیترووچ"۔

"جی میں ایوان پیترووچ نہیں ہوں میں پیتر ایوانوچ ہوں"

"ہاں......ہاں۔ وہی تو پیوتر ایوانوج یور ایکسیلنسی!...... پیوتر ایوانوچ!

آپ جیسی عظیم ہستیوں کے آگے تو ہماری زبانیں بھی اینٹھ کر رہ جاتی ہیں۔ میں نے تو حضور والا کو پہلی نظر میں ہی پہچان لیا تھا اور طے بھی کر لیا تھا کہ یُور ایکسیلنسی کو اپنے یہاں مدعو کروں گا۔ مجھے کامل یقین ہے کہ عالیجاہ اپنے ایک بوڑھے عقیدت مند کی التجا کو کبھی نہیں ٹھکرائیں گے۔ تو حضور والا! کل رات ڈنر پر تشریف لا کر ناچیز کا دل رکھ لیجئے۔ یورپ ہوٹل کمرہ نمبر ۱۳ یاد رکھئے گا۔

●

بشیر شاہ

سب سے محفوظ جگہ

پرانی عادت ہے میری!

ہر صبح کمرے کی کھڑکی کے پٹ کھول دینا، نیلے آسمان کی نیلاہٹوں میں نگاہیں دوڑانا، موسم پھولوں کا ہو تو آس پاس کے سارے سبزے کو آنکھوں میں سجا لینا!

اور یہ کل کی بات ہے!

......جیسے ہی میں کھڑکی کے پٹ کھولتا ہوں، ایک ننھی سی، نرم و نازک سی، نوزائیدہ چڑیا میری نگاہ کا مرکز بن جاتی ہے۔ آنگن کے بیچوں بیچ سہمی سہمی سی، سمٹی سمٹائی سی ......اس سے پہلے کہ وہ میری Doggie کا نوالہ بنے میں تیزی سے زینے اُترتا ہوں چڑیاں کو بڑی احتیاط کے ساتھ پہلے ہتھیلی پر اور پھر اپنے ایک منزلہ مکان کی سلیب پر رکھ آتا ہوں، اس خیال سے کہ یہ سب سے محفوظ جگہ ہے !!...... اس کے فوراً بعد اخبار کی سرخیوں کے ساتھ باتھ روم میں بند ہو جاتا ہوں......!! باہر آ کر دیکھتا ہوں کہ پنکی بے حد ایکسائیٹڈ ہے!

پاپا......پاپا......او پاپا......

"کیا ہوا بیٹے......کیا ہوا......"؟

"پاپا......پاپا...... ابھی ابھی ایک چیل آسمان سے زمین کی طرف آئی اور لے اُڑی چڑیا کو اپنے پنجوں میں"! پنکی ایک ہی سانس میں کہہ جاتی ہے!

☆☆☆

زاہد مختار☆

نجات

وہ یہاں کیسے پہنچا تھا یہ ایک لمبے سفر کی طویل کہانی تھی۔ وہ خود اُس کہانی، اُس کہانی کے سبھی کرداروں اور اُس سفر کی مجروح ساعتوں کے درد کو بھول جانا چاہتا تھا۔ اُس نے یہاں پہنچنے سے پہلے بھی اپنے ماضی سے پیچھا چھڑانے کی بے سود کوشش کی تھی لیکن وہ اس معاملے میں اتنا بے بس تھا کہ اُسے اپنے شہر میں کوئی ایسا ہمنوا بھی نہ ملا جس کے ساتھ وہ دو پل گزار کر اپنے ماضی کی تلخیوں سے نجات پالیتا۔ اور یوں جب حالات نے اُسے وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا تب بھی اُس کا ماضی اُس کے دامن سے لپٹا رہا، موت کے خوف کی طرح۔

اب وہ یہاں تھا، یہاں ایک اجنبی شہر میں، جہاں اب کوئی نہیں مرتا۔ جو یہاں آتا ہے وہ ہمیشہ یہیں کا ہو کے رہ جاتا ہے چاہے وہ کتنا ہی لاغر، کمزور اور بوڑھا کیوں نہ ہو جائے۔ اُس نے اس شہر کے ہر باشندے کے موت سے بے پرواہ دیکھا اور یوں کچھ دیر کے لئے وہ بھی سکون کی چند سانسوں کو اپنی رگ و پے میں محسوس کرنے لگا۔

اُسنے کچھ دنوں کے بعد یہ کہانی بھی سن لی کہ بہت پہلے شاید ایک آدھ صدی قبل اُس شہر کے چند بہادر جیالوں نے موت کو نیچ چوراہے پر قتل کر دیا تھا۔ حالانکہ اُسے قتل کرتے کرتے اُن جیالوں میں سے کچھ نوجوان کو خود بھی موت کا شکار ہو چکے تھے لیکن اُن کے اجسام اس شہر کی سڑکوں سے گزرنے والے آخری جنازے کا عنوان بنے۔

☆ نئی بستی اسلام آباد کشمیر

انہیں بڑی شان کے ساتھ دفنایا گیا تھا۔ اُن کی قبر پہ سنگ مرمر کے خوبصورت کتبے، خوبصورت تحریروں کے ساتھ آج بھی اُن کی شان میں قصیدہ گو تھے اُن قبروں کا دیدار اُسنے بھی ایکدن کیا۔ ٹھیک اُن قبروں کے قدموں کے پاس ایک اور قبر تھی۔ بظاہر کافی بڑی لیکن قدرے خستہ حال اور کہنے والوں کا کہنا تھا کہ وہ موت کی قبر ہے۔ اُس موت کی جسے ان نوجوانوں کے طفیل بیچ چوراہے پر قتل کردیا گیا تھا۔

اسی اجنبی شہر میں اب وہ اپنے ماضی کے ساتھ وارد ہوا تھا موت کے ڈر کی وجہ سے۔ یہاں اُسے اگرچہ موت کے خوف سے نجات ملی تھی لیکن اُسے یہ خدشہ اب بھی لاحق لگا رہتا تھا کہ کہیں اُسکا ماضی اُسے اس شہر کے چوراہے پر سنگسار نہ کروادے۔ وہ جانتا تھا کہ اس شہر میں اُسکی سزا، سزائے موت نہیں ہوسکتی لیکن وہ زندان کے عذاب سے جسم و جان کی اذیتوں تک کسی بھی احساس کا تصور کر کے ہی کانپ اُٹھتا تھا اور اُسی تصور کو حقیقت سے دور رکھنے کے لئے وہ اکثر سفید اُجلے کپڑے پہننے لگا تھا تاکہ کوئی اُسکی روح کا داغ داغ دامن نہ دیکھ سکے۔ وہ ہر رات پلکوں کے بوجھل ہونے سے پہلے اپنے ماضی سے نجات کی دُعائیں بھی مانگنے لگا تھا اور اُن لمحات میں نہ جانے کیوں اُسکا ماضی بھی دور ایک کونے میں خاموش، اُسکا تماشہ دیکھتا رہتا جیسے اُسکی بے چارگی، لاچاری اور تسکین قلب کی تلاش کا مذاق اُڑا رہا ہو۔ وہ دعائیں مانگنے کے بعد بظاہر کچھ دیر کے لئے پُرسکوں نیند کی آغوش میں چلا جاتا لیکن جب اُسکا ماضی اُسکے خوابوں میں آکر اُسکے سکون کو درہم برہم کردیتا تو وہ رنج و محن کی اذیتوں کا قیدی بنا رہتا، سحر ہونے تک۔

اُسکے سارے دن پُرکیف لمحات کے متلاشی رہتے۔ اب اُسنے لوگوں کی خدمت کو اپنا شعار بھی بنالیا تھا یہ جان کر کہ شاید یوں اُسے اپنے شاندار مستقبل کی کوئی راہ اچانک اُسی طرح مل جائے جس طرح اُسے اس عجیب شہر کا راستہ مل گیا تھا اچانک اور غیر متوقع۔ اسی کشمکش، اسی اُمید اور ان ہی خوابوں کے سہارے کئی ماہ و سال بیت گئے۔

اُس نے ان برسوں میں اگر چہ انجام خوف سے نجات حاصل نہیں کی تھی لیکن اپنی زندگی کے کچھ Relaxed لمحوں سے اپنے ارد گرد کے ماحول کو نہ صرف اپنا دیا تھا بلکہ اب وہ اس شہر کے چند معززین میں بھی شمار ہونے لگا تھا۔

آج اُنہیں شہریوں کا ایک عظیم عالیشان اجتماع ہونے والا تھا۔ اُسے بھی ایک خوبصورت دعوت نامے نے اپنی اہمیت کا احساس دلایا تھا اور وہ آج سویرے سے ہی ایک قد آدم آئینے کے سامنے اپنے آپ کو اور زیادہ پُر وقار اور پُر جلال بنانے کی سعی کر رہا تھا کہ اچانک اُسے آئینے میں اپنے عکس کے بجائے اپنے ماضی کی ایک جھلک نظر آئی۔ وہ تلملا اُٹھا۔ آج اُسکا اپنا ماضی اُسکے زخموں کو کریدنے کی قسم کھا چکا تھا اسی لئے آئینے میں اُس لمبی کہانی کا وہ منظر منعکس تھا جسے وہ یاد کرنے کی جرأت نہیں کر پاتا تھا۔

منظر میں، ایک درمیانہ عمر کی ماں سے اُسکا نو جوان بیٹا مخاطب تھا۔

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو ماں۔۔۔ کیا میں تمہارا بیٹا تمہارے اور اپنے بارے میں کوئی غلط فیصلہ لے سکتا ہوں"

"بیٹے۔۔ مجھے تمہارے فیصلے کی نہیں بلکہ تمہارے مستقبل کی فکر ہے۔۔ تم مجھے اس چھوٹے سے گھر سے نکال کر جس بڑی حویلی میں لے جانا چاہتے ہو وہاں تمہاری ماں کو کچھ دنوں تک عزت تو ملے گی لیکن پھر۔۔۔۔"

"نہیں ماں نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ وہ ایک رحم دل سیٹھ ہے جو ایک جوان، خوبصورت اور بن ماں کی بیٹی کا باپ ہے۔ کیا پتہ ہم دونوں کی محبت اور اپنائیت آج کے اس معمولی تعلق کو کل کسی رشتے میں بدل دے۔ اور میں اُس گھر کا داماد بن جاؤں"۔

"بیٹے تم بچپن سے ہی بڑے بڑے خواب دیکھتے آرہے ہو حالانکہ تم خود جان چکے ہو کہ ہم جیسے چھوٹے لوگوں کے چھوٹے چھوٹے خواب بھی پورے نہیں ہوتے۔ اب ہم ایک اور خواب کے لئے کیوں اپنی باعزت زندگی داؤ پہ لگا دیں"۔

"او۔۔۔ماں۔۔۔تم خواب بُننے سے پہلے ہی وہم کو اپنی آغوش میں پناہ دیتی ہو۔میں اُس حویلی کی ایک ایک نس سے واقف ہو چکا ہوں' میں نے حویلی کے مالک کی کمزور رگ پر ہاتھ بھی رکھ دیا ہے تبھی تو وہ مجھے اپنی ماں کے ساتھ عمر بھر کے لئے اپنانے کو تیار ہے"۔

"بیٹے' ضد سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔تم اگر مجھے سمندر میں بھی ڈوبنے کیلئے کہو گے' میں اُس میں بھی غرق ہونے کے لئے تیار ہوں لیکن میری بس اتنی سی تمنا ہوگی کہ تمہاری کشتی کنارے لگ جائے"۔

"نہ کوئی ڈوبے گا اور نہ ہی کسی کشتی کے مقدر میں بھنور لکھا جائے گا۔

"موقع ایک بار دروازے پہ دستک دینے آتا ہے' ہمیں اس دستک پہ اپنا دروازہ کھول دینا چاہئے"

جو تمہاری مرضی بیٹا۔۔۔میں نے جو کہنا تھا وہ میں نے کہہ دیا"۔

ماں اس کے بعد خاموش ہوگئی تھی' عمر بھر کیلئے خاموش......وہ تب بھی کچھ نہ بولی جب اُس کے اکلوتے بیٹے کو حویلی کے سیٹھ نے بری عادتوں کا شکار بنادیا۔وہ تب بھی تڑپ تڑپ کے خاموش ہوگئی تھی جب بوڑھے سیٹھ نے اسکی پاکیزگی کو تار تار کردیا تھا۔

اور۔۔۔وہ تب بھی خاموش ہی تھی جب اسکی نعش کو چوری چھپے ایک کنویں میں پھینک کر اُسے خودکشی کا عنوان عطا کیا گیا تھا۔لیکن۔۔۔

آج اُس کے سامنے اس کا آئینہ بول رہا ہے اور اُس سے یوں لگا کہ ایک جانب جہاں آئینے نے اُسے اپنے ہی سامنے عریاں کردیا تھا وہاں خود یہ روح فرسا مناظر دیکھکر آئینے کا سینہ بھی چھلنی ہوگیا تھا۔آئینے کی کرچیں بکھر گئیں اور اُسے آئینے کی روح لہولہاں ہوتی ہوئی نظر آئی۔

وہ اپنے کمرے میں ہانپنے لگ گیا۔اب آئینے کے ہر ایک ٹکڑے میں اُسے

اپنے سیاہ ماضی کا ایک ایک منظر دکھائی دینے لگا تھا۔ ایسے ہی ایک ٹکڑے میں اُسکی لمبی کہانی کا وہ آخری منظر بھی عیاں تھا۔

اب اس منظر میں وہ ماں کی جدائی کا معاوضہ مانگ رہا تھا۔ اُسکے چہرے پر اب غصہ، ندامت اور بغاوت کے مختلف رنگوں نے ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک نئے ہی رنگ کو جنم دیا تھا لیکن اس سب کے بدلے میں اُسے ایک سزا ملی۔ حویلی کے بوڑھے سیٹھ نے اُس کے پیچھے حویلی کے جوان سیاہ اور وحشی کتے چھوڑ دئے اور وہ اُن کتوں سے بچنے کے لئے اپنے شہر کی اندھی اور سیاہ گلیوں میں بھاگتا رہا، بھاگتا رہا۔۔ نہ جانے کتنے دن، کتنے ہفتے، کتنے ماہ اور کتنے سال اچانک اُسے اس اجنبی شہر کا راستہ مل گیا جہاں موت کو ایک یا آدھ صدی قبل قتل کر دیا گیا تھا اور حیران کن بات یہ تھی کہ اس شہر کی سرحدوں میں داخل ہوتے ہی اُسکے پیچھے بھاگتے ہوئے کتوں کے قدم بھی رک گئے۔ اُنکی باہر نکلی ہوئی اور رال ٹپکتی ہوئی زبانیں اُنکے اپنے ہی دہانوں میں غائب ہو گئیں اور وہ سارے کتے خفت زدہ، مایوس اپنی جگہ پہ ہانپتے رہ گئے۔

وہ کرچوں کی دُنیا میں اپنی سانسیں سمیٹنے لگا اور اچانک وہ اپنے اس کمرے سے بھاگ گیا جس میں اسکا ماضی ٹکڑوں میں بکھرا ہوا تھا۔

کچھ دیر کے بعد وہ اپنی بیقرار دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے اپنے اُجلے سفید لباس شکنیں دُرست کرتے ہوئے جب اُس عظیم الشان اجتماع میں پہنچا تو زندگی میں پہلی بار اُسے ایسا محسوس ہوا کہ آج اُس کے دامن سے اُس کا ماضی لپٹا ہوا نہیں ہے۔

کچھ دیر بعد وہ اجتماع کے اہم ترین ایجنڈے کی جانب متوجہ ہوا۔ اب اُس سے معلوم ہوا کہ یہ عجیب و غریب شہر کس مصیبت کا شکار ہو چکا ہے۔ اجتماع کا صدر پریشان لہجے میں شہریوں سے مخاطب تھا۔

"آپ سبھی جانتے ہیں کہ اس شہر کی آبادی دن بدن بڑھ رہی ہے' لوگوں کے

پاس اَب سَر چھُپانے کے لئے جگہ نہیں۔ بیمار اور لاغر لوگ اب سڑکوں اور چوراہوں پر ڈیرا ڈال چکے ہیں۔ ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے لئے چادر اور چار دیواری کا مسلۂ سانپ کی طرح پھن پھیلائے کھڑا ہو چکا ہے اس لئے ہم آج یہاں جمع ہوکر یہ فیصلہ لینے پر غور کرنیوالے ہیں کہ اس شہر کے وسیع ترین قبرستان کو ایک آبادستی میں تبدیل کیا جائے۔"

مجمعے میں کاناپھوسی شروع ہوئی۔ سب یوں تو اس بات پہ متفق تھے کہ اس شہر کو اب برسوں سے قبرستان کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی لیکن قبروں کو ڈھا کر عمارتیں تعمیر کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ چار قبریں تھیں جن میں اُن نوجوانوں کو دفن کیا گیا تھا جنہوں نے ایک معرکتہ الآرا تاریخ رقم کر کے موت کو بیچ چوراہے پر قتل کر دیا تھا۔

عام وخواص اُن قبروں کے لئے فکر مند تھے جبکہ اُنہیں اپنے آباؤ اجداد کے مقبروں پر عمارتیں کھڑی کرنے میں کوئی اعتراض نہ تھا۔ کچھ لوگ یہ خدشہ بھی ظاہر کرنے لگے تھے کہ اُن نوجوانوں کی قبروں کے ساتھ ساتھ موت کی قبر کو بھی چھیڑا نہیں جاسکتا کیا خبر کونسی بلائے آسمانی پھر اُس شہر کو اپنی لپیٹ میں لے اور لوگوں کو ایک اذیت ناک زندگی گزارنے پر مجبور ہونا پڑے۔

یوں سارے اجتماع پر ایک سکوت طاری ہونے لگا۔ ہر ایک اپنی اپنی سوچ کے سمندر میں جیسے غرق ہوگیا۔ سر سے سر جڑ گئے لفظ سے لفظ ٹکرانے لگے اور آخر میں اکثریت نے یہ رائے دی کہ لوگوں کو ننگے آسمان کے رحم وکرم پر بھی نہیں چھوڑا جاسکتا۔ چادر اور چار دیواری کا انتظام ناگزیر ہے۔

جب یہ فیصلہ صاحب صدر سنا رہا تھا تب ــــ وہ خاموشی سے اُٹھ کر چلا گیا۔ شہر کے سب ذی عزت لوگوں کو حیرت زدہ چھوڑ کر۔ کچھ دیر کے بعد اُسکے قدم واپس اُس شہر کی طرف جارہے تھے جہاں موت اب بھی زندہ تھی۔

☆★☆

ریڈیو انٹرویو کا آخری سوال

"آپ کی اجازت سے ایک آخری سوال"

"ضرور ضرور" میرا مخاطب مجھ سے کہتا ہے۔

"آج کی دنیا میں اور آج کے سماج میں جب قدروں کا ردو قبول عام ہو گیا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ حُسن و عشق کے بنیادی تصورات، محرکات اور معیار میں کوئی واضح فرق رونما ہوا ہے؟"

"جی ہاں"! وہ اعتماد کے ساتھ جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں......

"اس سلسلے میں ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ پچھلے زمانے میں لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں عمر گزار کرتے تھے، لیکن اب!"

"اب کیا؟! میں استفسار کرتا ہوں۔

"اب آنکھیں درمیان سے ہٹ گئی ہیں"!! وہ کہتے ہیں۔

☆☆☆

پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر مجید مضمر

ڈھوپ لہو کی

ہر ایک بزم میں لگتا ہے نغمہ خواں ہمدم
ہر ایک شعر میں وہ تازہ تر دکھائی دیا

ہمدم کاشمیری اردو کے معتبر شاعر بلکہ کہنا چاہیئے کہ کہنہ مشق شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنے شعری سفر کا آغاز آدھی صدی ادھر ۱۹۵۸ء میں کیا جب ان کی غزل 'پگڈنڈی' امرتسر میں شائع ہوئی تھی۔ اس آدھی صدی کے دوران جہاں دوسرے شعراء نے درجنوں مجموعے شائع کروائے وہاں ہمدم کاشمیری اپنا ایک مجموعہ حال ہی میں لے آئے جس کا عنوان ہے 'ڈھوپ لہو کی'...... یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ۶۱ غزلوں پر مشتمل یہ مجموعہ آدھی صدی کے عرصہ کے بعد شائع ہوا لیکن اس کی بھی ایک وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمدم کاشمیری بنیادی طور پر بڑا منسکر المزاج ہے اور یہ انکسار جو ہے وہ تشہیر کا تقاضا نہیں کرتا۔ وہ خود کہتے ہیں۔

لکھا تھا جو اپنی خاطر
شب خون میں چھپوایا ہم نے

یعنی ایک طرح سے جیسا کہ لوگ کرتے ہیں کہ لکھتے ہیں، چھپواتے ہیں۔ ہمدم صاحب شاید ہی اس مزاج کے آدمی ہیں۔ بہر حال یہ غنیمت ہے کہ ہمدم کاشمیری کا شعری مجموعہ 'دھوپ لہو کی'، منظر عام پر آیا ہے اور یہ کتاب جو آج ہمارے تبصرے کا موضوع ہے۔

میرے ساتھ اس وقت شریک گفتگو ہیں اردو کے نامور نقاد پروفیسر جناب قدوس جاوید۔ تو جاوید صاحب ہمدم کاشمیری ہمارے بہت پرانے شاعر ہیں حالانکہ حامدی صاحب یا حکیم منظور صاحب یا جو اتنے شعراء ہمارے یہاں ہیں ان سے بہت پہلے شاعری شروع کی لیکن بہت زیادہ تشہیر ان کی ہوئی نہیں۔ ایک تو ہمدم صاحب خود اسکی وجہ ہیں لیکن ایک بات ہے دھوپ لہو کی جو ان کی کتاب ابھی آئی ہے ٦١ غزلوں پر مشتمل بڑی خوبصورت شاعری ہے۔ کئی اعتبار سے مثلاً زبان وبیان اور لہجے کے اعتبار سے۔ عصری حسیت کے اعتبار سے، روایت پسندی کے اعتبار سے یا عام آدمی کے جو مسائل ہیں ان کو تخلیق کا درجہ کس طرح سے انہوں نے دیا ہے۔ شعر میں کس طرح ڈھالا ہے اور اس اعتبار سے ہمدم صاحب ہماری کئی آوازوں سے منفرد قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

پروفیسر قدوس جاوید:...... میں نے ہمدم کاشمیری کے اس مجموعے کو بغور دیکھا اور میرا پہلا تاثر یہ ہے کہ ایک عرصے کے بعد اتنی اچھی غزلوں کا اتنا اچھا مجموعہ سامنے آیا۔ ہمدم کاشمیری جیسا کہ آپ نے کہا ہے کہ گزشتہ تقریباً پچاس برسوں سے لکھ رہے ہیں اور ان کی غزلوں کے مطالعے سے کئی باتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہمدم کاشمیری غزل کی روایت سے واقف ہیں اور اسکے مزاج

سے واقف ہیں، اس کے منصب سے واقف ہیں۔ اسی لئے جیسا کہ اس کتاب کے دیباچے میں عرضان صدیقی نے لکھا ہے۔

کچھ باتیں اچھی ہیں لیکن بہت سی باتوں سے مجھے اختلاف ہے۔ مثال کے طور پر عرضان صدیقی نے یہ بار بار اور اصرار کے ساتھ لکھا ہے کہ ہمدم کاشمیری جدید شاعر ہیں۔ اب یہ فقط جدید کا استعمال خاص مضمون میں لیا جائے تو کسی بھی شاعر کیلئے باعث فخر نہیں ہوسکتا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ جدید ہونے کا تعلق زمانے سے کیا ہوتا ہے اور شعر کے اسلوب سے اور درجے سے کیا ہوتا ہے جسکی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔ ہمدم کاشمیری کا امتیاز یہ ہے کہ اکثر و بیشتر غزلوں میں انہوں نے کسی ٹھوس خارجی تجربہ کو بیان نہیں کیا ہے۔ ٹھوس خارجی حقیقت کو بیان نہیں کیا ہے چونکہ غزل یوں بھی ایک Direct بیان کی صنف نہیں ہے۔ اس کی خوبی ہی یہی ہے کہ اول تو اس میں کسی ٹھوس خارجی تجربہ کو بیان نہ کیا جائے دوسری بات یہ کہ جو کچھ بھی بیان کیا جائے اس کا براہ راست بیان نہ ہو اس طرح کے ٹھوس تجربوں کیلئے اور براہ راست اظہار کیلئے دوسری اصناف ہمارے یہاں موجود ہیں۔ غزل کی خوبی یہی ہے کہ اس میں انسان اپنی ذاتی اور اپنی اجتماعی زندگی کے تمام تجربات کو تمام شعور اور لاشعور اپنی ذات میں سمیٹ کر تخلیقی تجربات کا اظہار کرلے۔ طلسمی تجربات کا اظہار۔ اور یہ چیز ہمدم کاشمیری کے یہاں بہت ساری غزلوں میں نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک غزل دیکھئے جو خاص طور سے اس حوالے سے۔ جس کے اشعار کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

ایک بھی موسم میرے اندر نہ تھا
اورآنکھوں میں کوئی منظر نہ تھا
میرے دائیں بائیں تھیں پرچھائیاں
میرے ہاتھوں میں کوئی خنجر نہ تھا
خواب اپنے کیا حقیقت ہوگئے
لمس کیسا تھا اگر پیکر نہ تھا

تو اس طرح کے اشعار ہمدم کاشمیری کے یہاں ملتے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ بھرپور شاعرانہ صلاحیتوں کے مالک ہیں اور یہی ان کا امتیاز ہے

پروفیسر مجید مضمر:......ایک اور بات ۔ ہمدم کاشمیری غزل کے شاعر ہیں اور جیسا کہ آپ نے فرمایا غزل کے مزاج سے وہ پوری طرح سے واقف ہیں لیکن ہمدم کاشمیری نے پچھلی آدھی صدی، تقریباً پچاس برس کا عرصہ جو ہے مختلف رجحانات اس دوران آتے رہے جاتے رہے۔ ترقی پسندی بھی یہاں مثلاً خاص طور سے۔ اس کے بعد جدیدیت اور مابعد جدیدیت۔ مختلف رَویئے مختلف اسالیب اور مختلف طرزِ فکر جو ہے ان تبدیلیوں کے باوجود ہمدم کاشمیری کی ان غزلوں میں ایک عیب سی رَوانی ملتی ہے۔ روانی اس طرح کی نہیں کہ اسلوب کی بلکہ ان کا سٹائل ہے جو کہیں ایسا نہیں لگتا کہ ہمدم صاحب فوراً بدل جانے کے زمانے کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ایک خاص رَو میں وہ چلے ہیں اور وہی رَوانہوں نے اپنائی ہے۔

اسکی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ انہوں نے شروع کیا تھا ناصر کاظمی کی

غزلوں سے متاثر ہوکراور جیسا کہا بتدائیہ میں کہا گیا ناصر کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں بلکہ مجھے یاد ہے کہ اُن کی جو پہلی غزل ' پگڈنڈی' میں شائع ہوئی تھی اسکے ایک دواُشعار ہیں:

بہار آتو گئی ہے مگر خدا جانے
میری نظر میں ہیں آباد کتنے ویرانے

یہ جوانی کا معاملہ تھا۔

ہر ایک ذرہ ہے صحرا ہر ایک فکر جنوں
قدم قدم پہ نظر آرہے ہیں دیوانے

اس کے بعد ہمدم صاحب کو جدیدیت کے رجحان کے تحت کوئی خاص تبدیلی لانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ۔ بلکہ انہوں نے عصری حسیت کا مظاہرہ بھی بھرپور طریقے سے کیا۔ایک خاص شعر یاد آرہا ہے۔

ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے گم صم
سڑک پہ مجھ سے بڑا اشتہار تھا، میں تھا

یعنی موجودہ دور میں جو مسائل ہیں جو معاملات ہیں ان کو شعری تخلیق میں سمونا اور اس کا اظہار جس طرح سے آپ نے کہا کہ تخلیقی طور پر کرنا اور تخلیقی اعتبار سے کرنا ہمدم صاحب کو آتا ہے ۔ان کے اسلوب کا معاملہ جو ہے زبان وبیان کا معاملہ اس پر جو بہت ہی نرم رُواور بہت ہی شائستہ اور رواں کہئے ۔اس بارے میں آپ کیا کہیں گے۔

قدوس جاوید:...... یہ آپ نے بالکل صحیح اشارہ کیا ہے کہ ان کی تمام

غزلوں کے مطالعہ کے بعد ایک خاص صفت نظر آتی ہے۔اگر گہرائی میں اتر کر ان اشعار کو دیکھیں ایسا معلوم ہوگا کہ اس وقت جو ہمارے آس پاس پوری دنیا میں انسانیت کے خلاف اور انسانی قدروں کے خلاف جو ایک بازار گرم ہے اس کا بہت شدید احساس ہمدؔم کاشمیری کو ہے۔جگہ جگہ انہوں نے اپنی ذات کا بدل جانے اپنے شہر کا بدل جانے اور اندر اور باہر کے اُلمیوں کا ذکر کیا ہے۔لیکن آپ نے صحیح فرمایا کہ ان کا جو لہجہ ہے ان کا جو اسلوب ہے ہر جگہ اس میں ایک شائستگی پائی جاتی ہے اور اتنی خوبی کے ساتھ انہوں نے اس سارے کرب کو بیان کیا ہے جو خوبی غزل میں اظہار کیلئے بہت ضروری ہے یعنی بڑے ہی اِشاراتی اور ایمائی انداز میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار اَپنے اشعار میں کیا ہے۔

پروفیسر مجید مضمر:......احساس کے راستے یا احساس کے حوالے سے مختلف حقائق کا اظہار کرنا......کاٹتے ہوئے:

پروفیسر قدوس جاوید:......شاعر کی خوبی یہی ہوتی ہے کہ ظاہر ہے شاعر اسی معاشرے میں رہتا ہے جس میں دوسرے لوگ رہتے ہیں۔انہی حقائق کو جھیلتا ہے انہی مسائل، مصائب کو جھیلتا ہے جسے دوسرے لوگ جھیلتے ہیں۔لیکن بڑا شاعر وہی ہوتا ہے جو ہر حقیقت اور ہر مسئلے کو اپنی ذات میں اتار کر اپنے جذبے کا، اپنے احساس کا حصہ بنالے اور اس کا تخلیقی اظہار کر پائے جو ہمدؔم کاشمیری صاحب بڑی کامیابی کے ساتھ کر پاتے ہیں۔

پروفیسر مجید مضمر:......اور اب دو باتیں اور اس مجموعے کے تعلق سے کہی جاسکتی ہیں۔ایک یہ کہ ہمدؔم صاحب کو منظر نامہ وسیع ملا۔پھر ہمارے یہاں اکثر

شعراء جو یہاں کشمیر کے ہیں جو وادی میں ہی رہے۔ ہمدم صاحب نے پچیس تیس سال باہر ہی باہر گزارے۔ اس وجہ سے ان کا منظر نامہ وسعت پا گیا۔ اس وسعت میں ان کے یہاں مقامی رنگ جو ہے، مجھے کہنا چاہئے کہ وہ نظر نہیں آئے گا کہ اس طرح وہ کشمیر کے شاعر ہیں جس طرح سے حکیم منظور اور حامدی صاحب کے اشعار کے تعلق سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ہاں یہ خاص علاقہ کی شاعری کی بُو باس اِس میں آتی ہے۔ میرا یہ ذاتی تاثر ہے کہ خاص طور سے دھوپ لہو کی، کے شعری مجموعے میں جو ملتا ہے وہ وسیع منظر نامہ ہے۔

پروفیسر قدوس جاوید:...... بلکہ میں پہلے سوال کے حوالے سے آپ نے ابھی جو بات کی، کہنا چاہوں گا کہ انہوں نے جو محاورے استعمال کئے ہیں یہ خاص طور پر ان کی اس وسعت نظر کا نتیجہ ہے۔ مثال کے طور پر ایک شعر ہے ؎

سالہا سال رہا پاؤں میں چکر اس کے
دربدر پھرتا رہا ٹھور ٹھکانے والا

یہ جو محاورہ استعمال ہوا ہے، پاؤں میں چکر ہونا اور ٹھور ٹھکانے والا ہونا دراصل اپنے محاورات کا، ضرب الامثال کا، اپنے الفاظ کے امکانات کا شعور رکھنے والا شاعر ہی بڑا شاعر بن پاتا ہے۔

اور یہ شعور ہمدم کاشمیری کے یہاں کشمیر کے دوسرے شعراء کے مقابلے میں، مجھے ذاتی طور پر زیادہ ہی نظر آتا ہے۔ اور میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ چونکہ ان کیلئے تشہیر کا سامان نہ تھا یا ان کی خاص طبیعت منسکر المزاجی کہئے یا لاابالی پن کہئے کہ کبھی انہوں نے اپنے آپ کو مشہور ہونے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ یہ تو نہ کسی

یونیورسٹی کے پروفیسر رہے، جہاں تک میں جانتا ہوں، نہ کسی اخبار کے مدیر رہے اس لئے اپنے آپ کو مشہور کرنے کیلئے کوئی حربہ یا ہتھکنڈہ استعمال نہیں کیا۔ لیکن یہ یقین ماننا چاہئے کہ آج جب ہم پورے ہندو پاک کے تناظر میں اس کتاب کو رکھ کر دیکھیں اور آج جیسا کہ ظفر اقبال کی شاعری ہے، شہریار کی ساقی فاروقی کی شاعری ہے یا پھر یہاں رفیق راز اور اسعد بدایونی کی شاعری ہے یا پھر عرفان صدیقی اور مظہر امام کی شاعری۔ تمام لوگوں کی جو غزلیہ شاعری ہے اس کو ایک طرف رکھ کر کے پھر ہمدم کاشمیری کی غزلوں کو ہم دیکھیں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ بڑا معتبر لہجہ ہے۔ مفید فکر ہے۔ اس کی پذیرائی ہونی چاہئے۔ یہ ہمارا فرض بنتا ہے۔

پروفیسر مجید مضمر:...... یہ انفراد بہر حال اس میں ہے۔ اب دیکھئے وہی شائستگی کی بات۔

اب یہاں کس سے کرے کوئی شکایت ہمدم
شہر اپنا ہے جنوں اپنا ہے پتھر اپنے

اقبال فہیم

شاعری کی ایک نئی توجیہہ

عبدالقیوم ہمدم کشمیری نہایت ہی شریف آدمی ہیں اور شاعری بھی۔ میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ شاعر کے لئے شریف ہونا لازمی ہے اور شرافت کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بنا شرافت کے اچھی شاعری ممکن ہے یا نہیں۔ یہ بھی سوال ہے کہ شرافت کس قسم کی ہونی چاہیئے۔ سماجی سیاسی یا سماجی مذہبی ہونی چاہیئے یا روحانی۔ شرافت سے مراد یہ ہے کہ شاعر جو دیکھے، سُنے ہُو بہو اُسکو الفاظ کی عمدہ ترتیب کے ساتھ پیش کرے لیکن اِس طریقہ کار کی وجہ سے دیانتدار کا لفظ بھی شرافت کے ساتھ جُڑ جاتا ہے۔ اور شرافت اُلٹ کر دیانتداری پر آ کر جم جاتی ہے۔ ہوا یہ کہ شاعر کو دیانتدار ہونا چاہیئے اور سماج کے تئیں اُسکی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ یعنی شاعر جو دیکھے سنے بڑی دیانتداری سے اُسکو پیش کرے۔ لیکن یہاں پہنچکر ایک اور جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے کہ شاعر دیکھتا اور سُنتا کیا ہے۔ اگر مضامین غیب سے آتے ہیں اور غیب سے آئے ہوئے مضامین صفحہ قرطاس پر اُترتے ہیں تو شاعر کی حیثیت ثانوی بن جاتی ہے اور افلاطون کے اِس نظریئے کی حمایت ہوتی ہے کہ حقیقتِ مطلق اور حقیقتِ ثانی دو مختلف چیزیں ہیں۔ حقیقتِ ثانی حقیقتِ مطلق کی ہی پرچھائی ہے اور شاعر پرچھائیوں کو ہی دیکھتا رہتا

ہے حقیقتِ مطلق کو نہیں۔ شاعر کا یہ عمل حقیقتِ ثانوی کا ثانوی عمل بن جاتا ہے جس کو کہ افلاطون نے نقل کی عقل کہکر ثانوی عمل کو مُسترد کر دیا ہے اور شاعر کو اپنی ریاست سے بے دخل کر دیا۔ کہ اس کی نگاہ نقل پر ہوتی ہے حقیقت اس کی نظر سے ہمیشہ اوجھل رہتی ہے۔

ارسطو اپنے اُستاد کے اس نظریئے سے متفق نہ ہوا کہ یہ دنیا اپنی اصلی دنیا کی پرچھائی ہے۔ ارسطو نے مادہ اور ہیئت میں کسی قسم کی دوئی کا شائبہ تک نہیں دیکھا بلکہ اُس نے ''مادہ'' اور ''ہیَت'' کو ایک ہی جانا۔ اُس نے مفروضے کو قبول کرنے سے انکار کیا کہ ''تصور'' ''تصور کی پرچھائی'' دو مختلف چیزیں ہیں یہ کلہم طریقہ کار کا عمل ہے۔ یعنی مادہ اور ہیت Matter and Form لازم ملزوم ہیں۔

اِس کے معنی یہ ہوئے۔ پرچھائی اور حقیقت الگ الگ ہوتے ہوئے بھی الگ نہیں ہیں۔

ہر جزو کو کل کے ساتھ بے معنی ہے اتصال
دریا سے دُر جُدا ہے پہ ہے غرقِ آب میں

پرچھائی یا جُز ہمیشہ حقیقت میں غرق ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ صوفیوں کے ہاں یہ مفروضہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اور ابنِ عربی نے صفت اور موصوف میں دوئی پانے سے انکار اور اعتراض کیا ہے۔ تصوف کے مفروضوں کی بنیا ''جُز'' اور ''کُل'' پر کھڑی ہے۔ یہ لوگ دنیا اور حقیقت اولیٰ میں فرق کرنے سے اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ ان کے ہاں پھول کی خوشبو ایک ہی حقیقت ہے۔ خوشبو پھول سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتی ہے۔ صوفی شعراء کے ہاں کلہم تصور کا ایک تصور ملتا ہے۔

میں تصوف کے بارے میں اِس وقت کچھ کہنا نہیں چاہوں گا۔ بات یہ ہو رہی تھی

کہ مواد اور ہیت ایک ہی حقیقت ہے۔ شاعری کی اصطلاح میں موضوع اور ہیت دو الگ چیزیں نہیں ہیں یعنی متن ہی موضوع ہے۔ یعنی ان کا الگ سے اپنا کوئی وجود نہیں ہے۔ تبدیلی اِن کے بطن میں ہے اور ردو بدل ان کے مقسوم میں ہے۔ اس سے یہ نتیجہ آسانی سے برآمد ہو سکتا ہے کہ مادہ اور حقیقت دونوں متحرک ہیں۔ یہ بات ہمیں ہیگل سمجھانے کی کوشش میں لگا ہے۔ بعد میں کارل مارکس نے سماجی ناانصافی کو دیکھتے ہوئے اقتصادی بنیادوں پر ہیگل سے اتفاق نہ کرتے ہوئے کہا کہ مادہ Matter جدلیاتی عمل کے سبب ارتقاع پانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ جب کہ ہیگل کہتا ہے جو ہر Essence جدلیاتی عمل سے مادہ کو ارتقاع بخشنے میں مصروف رہتا ہے۔ یہ سب کچھ حرکت یا تبدیلی سے وجود میں آتا ہے۔ افلاطون کے ہاں تصورات میں حرکت نہیں ہے اسلئے ان کے ہاں تصورات میں تبدیلی کا امکان نظر نہیں آتا۔ قرآنِ پاک علم حاصل کرنے کے لئے تفکر کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ تفکر آنے سے تصورات غیب سے آتے ہیں اور ان کا جدلیاتی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور تصورات کا ارتقاع ہونے لگتا ہے۔
ارسطو نے ہماری عملی بصارت میں بڑی دستگیری کی ہے لیکن یہ کہکر غلطی سرزد کی ہے کہ شاعر اپنی دخل اندازی سے اپنے تصورات کو بڑھا گھٹا سکتا ہے۔ یہ بھولتے ہوئے کہ مادہ اور ہیئت ایک ہی چیز ہے تو اِس عمل میں گھٹانے اور بڑھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ارسطو کی بوطیقا پڑھکر پتہ چلتا ہے کہ فنکار یا شاعر کوئی ایک مستری ہے موجد نہیں اور تصورات جو ہر طرح سے اور ہر رنگ میں مکمل ہوتے ہیں رَدوبدل یا تبدیلی کو قبول نہیں کرتے ...... یہاں پر آکر ادراک، اِظہار اور ابلاغ کا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ ہر کلمے کے اس تصور سے مجھے اتفاق نہیں کہ دراصل ہم اپنے ہی تصورات کو دیکھتے ہیں اور ان کا ہی تجربہ کرتے ہیں اور مادی وجود تصورات کا تابع ہے۔ تصورات کی تبدیلی

سے مادی یا دنیاوی وجود میں تبدیلیاں ظاہر ہو جاتی ہیں ......شاعر چونکہ حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے اسلئے شاعر تصورات کی دنیا میں رہتا ہے اور تصورات کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ لیکن تصور کو اس کی کلہم شکل میں پیش کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

وائیکو (Vico) نے مجھے سمجھا دیا ہے کہ ادراک چیزوں کو ان کی کلہم صورت میں دیکھ نہیں سکتا ہے بلکہ چیزوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہر ایک ٹکڑے کو الگ الگ طور دیکھتا ہے جس کی وجہ سے پوری چیز یا پورا تصور دِکھائی نہیں پڑتا۔ یہ الہام ہے جو کہ چیزوں کو ان کی کلہم شکل صورت میں دیکھکر اور اپنی گرفت میں لاکر پیش کرتا ہے۔ ایسا کرنے سے تصور کی جمالیاتی صورت بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہو کہ شاعر یا فنکار پورے ''تصور'' کو پکڑ کر اَپنے ڈھنگ سے پیش کردے۔ وہی اسکی سب سے بڑی فنکاری ہوگی۔

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہماری کلہم اُردو شاعری تصورات کی باتیں کرتی ہے، تصورات کو کلہم شکل وصورت میں پیش نہیں کرسکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری اُردو شاعری میں جزیات کی بھرمار ہے۔ ''کُل'' کی شکل وصورت نظر نہیں آتی ہے۔ آپ شاید اِتفاق کریں گے اُردو شاعری میں پورے پیکر یا متحرک تصورات کہیں پر بھی نظر نہیں آتے ہیں۔ اُردو شعراء کی نظر ساغر و مینا رُخِ زیبا زلفِ عنبریں، صراحی دار گردن یا پتلی کمر اور تیر کمان پر پڑی ہے جسم پر نہیں بلکہ جسم کے کسی عضو پر پڑتی ہوئی دِکھائی دیتی ہے۔ اِس قسم کی شاعری کو میں لنگڑی شاعری کہتا ہوں۔ یہ لنگڑی شاعری افلاس سے بھری پڑی ہے۔ اس حقیقت کا احساس کرتے ہوئے مولانا الطاف حسین حالی نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں منظر کی طرف شعراء کو متوجہ کیا اور موضوعی شاعری کرنے پر زور دیا۔ چونکہ مولانا کو احساس ہو گیا تھا کہ شاعر ایک جذبے یا ''تصور'' کو اپنی گرفت میں لانے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں اِس لئے اُن کو چاہئے کہ بیرونی دنیا پر اُپنی توجہ مرکوز کریں اور

اپنے احساسات، جذبات کو کھل کر بیان کرنے میں کسی قسم کی دِقت محسوس نہ کریں۔ اِس طرح سے ذوق کی شاعری کو غالب کی شاعری پر ترجیح دی گئی اور شاعری کو پرکھنے کے نئے طریقے اور اسباب ڈھونڈے گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نظم وجود میں آگئی اور سماجی، سیاسی اور مذہبی باتیں اِس طرح سے نظموں میں پیش کی گئیں کہ روحانی اور نفسیاتی تصورات پسِ پُشت ڈال دیئے گئے۔ یہ اِسلئے ہوا کہ ہمارے اُردو شعراء کو اپنے تہذیبی یا روحانی دُکھ درد اور تردد کی پہچان نہ ہوسکی اور ادیبوں اور شاعروں کا یہ قافلہ بھٹکتا ہوا سر گردان پھرتا رہا۔ جب ان کو اپنے دکھ درد کی شناخت نہ ہوسکی تو اُنہوں نے نظریات کو پیش کیا۔ شاعری برائے شاعری اور شاعری برائے زندگی کے فضول نظریات کی روشنی میں شاعری کو پرکھنے لگے کہ الغرض کے نظریات کے ملبے میں شاعری دَب گئی۔ نظر اور نظریہ کی جنگ اور اخلاقی درس وتدریس شروع ہوگئی۔ ترقی پسندوں نے کچلے اور بے بس طبقوں کی نمائندگی کی کہ سماجی طبقاتی جنگ میں اُلجھ گئے۔ اقبال نے کہا کہ 'تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اَپنا تو بن'۔ یعنی شاعری اوروں کی نمائندگی کے لئے مقرر ہوئی۔

کلیم الدین احمد نے غزل کے خلاف بغاوت شروع کی اور غزل پر گردن زدنی کا حکم صادر کردیا کہ یہ نیم وحشی صنفِ سخن ہے۔ یہ نہیں کہ اُردو تنقید میں صرف افلاس زدہ لوگ ہی پیدا ہوئے بلکہ کچھ ذہین اور توانا ذہن بھی نظر آتے ہیں۔ شمس الرحمان فاروقی اور نارنگ تحقیقی قوت کے لوگ ہیں اور اِس حقیقت سے باخبر ہیں کہ ہمارے اُردو شعراء کسی ایک پیکر یا تصور کو اپنی مکمل شکل وصورت میں ادا نہ کرسکے ہیں اور نہ ہی اس کا واضح ادراک کر پائے ہیں۔ جدیدوں کا مادی دنیا سے منحرف ہونا کہ انہوں نے شعراء وادباء کی توجہ اندرونی دنیا جہاں کی تنہائی اکیلا پن اور قدروں کے جوڑ توڑ عمل کو جاری وساری رکھنے پر مرکوز کرانی چاہی، پورے تصور یا جذبے کو احساس کی سطح پر محسوس کرکے اپنی پوری

گرفت میں پورے جذبے کے ساتھ ادا کریں۔ایسا کرنے سے پورے پیکر یا جذبے کی ادائیگی ہوسکتی ہے۔اُن لوگوں نے جدیدیت کا نعرہ بلند کیا پر یہ نہ بتا سکے کہ تنہائی اور اکیلا پن کیسے وجود میں آتا ہے اور اِس کا سبب کیا ہے۔ اِس کا سبب فکری یا اقتصادی ومعاشی ہے۔ ہر شخص اس شہر میں پریشان سا کیوں ہے۔اس کی کوئی دلیل یا پیکر یا تصور کی پختگی نہیں ہے۔شاعر نے پریشانی کے پیکر کا ادراک نہیں کیا بلکہ یہ آواز محض ایک نعرہ ہے۔ایسے شعراء کا ادراکی عمل تاج کی کھڑکیوں اور دروازوں کو الگ الگ سے دیکھنے کا ہے نہ کہ پورے تاج محل کو۔

ایسے لوگوں کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا دیکھنا چاہتے ہیں اور کیسے دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کے دیکھنے کا وطیرہ اور طریقہ کار کیا ہے۔ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ادبی تحریکوں کی وجہ سے شاعری کو بہت نقصان اور تنقید نے ہماری تخلیقی بصارت کو بگاڑا۔

اُردو شاعری کی بدقسمتی ہے کہ اس نے ہر طرح کا اثر قبول کیا خاص طور پر فلموں کا۔فلموں میں پہلے بول کی بڑی اہمیت ہوتی تھی۔رفتہ رفتہ بول کو موسیقی نے ہڑپ کرلیا اِسطرح سے شاعری بیانبازی کی شکار ہوگی۔ میں اس قول کی حمایت میں مابعد جدید شاعری کو پیش کرنے کی ہمت کروں اور یہ کہوں گا کہ عبدالقیوم ہمدم کشمیری کی شاعری کی شاعری بیانات کی شکار ہوگئی ہے۔

ڈریڈنے اپنے لسانیاتی معاملے کو متن اور موضوع کے حوالے سے اپنی کتاب Grammarogy میں پیش کیا ہے۔اِس کا پورا لسانیاتی معاملہ ارسطو کے معروضے پر قائم ہے کہ مادہ اور ہیت دو مختلف حقیقتیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کا جدلیاتی عمل ہے۔ اکتشافی تنقید اس بات کو ابھی تک نہ سمجھ سکی ہے کہ ''تصور'' ایک ہی شکل وصورت میں پیش کرنا تخلیقی عمل داری ہے۔اور اکتشافی نظریہ تنقید کوئی نئی تنقید نہیں ہے۔شاید حامدی

صاحب نے ڈریڈ کو پڑھا نہیں ہوگا بلکہ اِن کا نام لیکر کلاسیکی تنقید کو از سرنو رائج کردیا ہے
میں نے ایک دفعہ حامدی صاحب سے پوچھا تھا کہ اکتشافی تنقید کے بنیادی مفروضے
کیا ہیں جن پر آپ کی تنقید کھڑی ہے۔ جواب میں اُنہوں نے فرمایا ابھی تک میرے
پاس مفروضے نہیں ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ بنا مفروضوں کے تنقید آگے بڑھادی
جاتی ہے اور اِس قسم کی تنقید ہماری روح کو روشن نہیں کرپاتی۔

..................☆☆☆..................

"شیرازہ" میں کشمیری، ڈوگری، پنجابی، لداخی
اور بلتی کی منظومات شائع ہوتی ہیں بشرطیکہ اُن کے
ساتھ اُردو ترجمہ بھی شامل ہو۔ (ایڈیٹر)

west,the adjacent hill regions were occupied by the Khasas.There settlement exteneded in a semicircle from Kishtwar to Jhelum Valley in the west.North of the Jhulum Valley as far as Muzaffarabad we find the Bombas as the neighbours of Khasas(later Khakhas).The upper Kishanganga Valley above the famous shrine of Sa ada was peopled by Dards.Megasthenese already new them in the upper Indus region.

With the advent of Islam there was a influx of a large number of Sufis and Sayyids.More than 700 of his followers were settled in Kashmir by Shahi Humadan in 14th Century,to be followed by a larger inflow of Sayyids from Central Asia and Persia during and after Timur's invansion of Northern India.Coming as they did from the line of the profit they were treated with great respect by the Muslim rulers and their subjects.Thy gained enormous influence and influenced the people.A large Chunk of Sayyid immigrants settled permanently in the Valley.

Hence the purity of race,which has been noted as distinguishing the great mass of pollution of Kashmir,may be admitted with a qualification.It is probably due not only to the isolated nature of the Valley,but also to the curious facility of absorbing foreign elements.Colonies of Mughals,Pathans,Punbjabis and Paharis settled within comparatively recent times in the Valley,have been amalgamated with remarkable rapidity through intermarriage and means.

What is, however,noteworthy is that this synthesis of various cultural elements has in no way resulted in debasement of the purity of their intelligence,there love of learning and fine arts and above all their deep .seated faith in the brotherhood of man.God bless them.

as ill-luck would have it, the life-giving river changed its course several times and ultimately dried up.

Known as Saraswat Brahmins,Kshatrayas and Vaishas,they left the Punjab in search of equally good if not a better land in the rest of the subcontinent.An enterprising batch went back to the mountains in the north to reside in the Kashmir Valley of whose beauty and salubrious climate they had heard from their forefathers who used to go there during summer but were driven out byu the indigenous inhabitants-the Nagas and Pishachas.They sought the protection of Nila,the Lord of Nagas and begged his permission to settle in the Valley permanently as his subjects.

Nila, says the Nilamatapurana, promised the requested permission on condition that they conformed to the social usages and the customs of the indigenous people and adopted their social customs and ceremonies.The Saraswats chief permitted them to reside permanently in the Valley.Many of these customs and ceremonies are even now a part of the social life of saraswat Brahmins in the Valley.

Other Immigrants

Coming to the historical period we find Asoka settling 5000 Buddhist monks in the Valley and gifting it away to the Sangha to be used for pursuing higher studies and sipiritual practices.Several races entered Kashmir later. We have historical evidence to the settlement of immigrants of the Persian,Greek and Turkish decent,the later coming before and during Kanishka's rule.

When Kashmir was under the influence of Buddhism, hundreds of Bikshus from here went to distant lands to preach the new religion.In return a large number of Buddhist scholars came from Tibet, China and Central Asia,most of whom settled in the Valley permanently.

The ethnography of the regions surrounding the Valley can be traced clearly from the *Rajatarangini*.In the south and

But ultimately the Pishachas from Central Asia began to swoop down into the Valley,particularly during the cold season when the Valley was comparatively warm.Described as short statured and ugly men from the north,they used to return to their homeland with the approach of summer.I would suggest that the Pishachas were the Chalcolithic tribes from Sinklang who moved towards Kashmir in search of better land and warmer climate.The location of a Menhir site in the Tarim basin on the international trade route to India,coincides with the site where the well-settled Pishachas of Kashmir fought annually with further Pishachas hordes trying to enter the Valley.

The *Nilamatapurana* mentions that the relations between the Nagas and Pisacas improved with the passing of time.But when there began an influx of Aryans from the Punjab,the situation changed.For the Nagas preferred the Aryans to the Pishachas and with their help they threw them back to the borders of the Valley. Having adopted the Naga rites and rituals at the hands of the Naga Chief,Nila,The Aryans slowly but surely absorbed the tribe into their social fabric.

In the absence of a better explanation of the presence of Aryans in the Valley, I had to depend on Grierson's theory in my History of Kashmir.But since its publication three decades ago,my extensive study and research on this important subject has convinced me that Grierson had erred and thae Aryans actually came from the plains of the Punjab.I am presenting my viewpoint in an exhaustive manner in my book on Kashmiri Pandits.

Saraswat Aryans.

Briefly speaking the earliest stream of Aryans who entered India,found the banks of the river Saraswati in the Punjab fertile and conducive to easy cultivation,and settled ther.The waters of the river spread prosperity all around and the settlers passed centuries there in peace,building well-planned towns and cities to live in. the Aryan society was by and by stratified into classes according to the kind of their work and profession or vama.But

background and the various stimuli,e.g.population pressure,finding fresh ground,etc.,have to be taken into consideration.

The Aboriginals of Kashmir

Hence the origin of the Naga and Pishacha legend as given in the *Nilamatapurana* and referred to by Kalhana may be attributed to the stimuli mentioned above.the legend relates to an early periodic movement of tribal people from Central Asia to the Kashmir valley.it refers to the ccupation of the valley after the desiccation of the lake Satisaras by the Nagas.It is difficult to identify the Nagas as they are still behind the veil of myth and legent,peeping out at one time as reptile snakes and at another as human beings.it is no surprise that different theories have been put forth by different scholars on their identification.

However, the view is now veering round to their being a tribe,maybe Pre-Aryan,who inhabited the mountain tracts of north-west India particularly Kashmir.Dr. Grierson says: " I am inclined to believe that the Nagas may have been the ancestors of the non-Aryan inhabitants of Hunza-Nagar whose language Burushaski has not been identified as belonging to any known family of speech".However,this opinion of Grierson is not tenable due to the absence of any remains of serpent worship among the people of Hunza-Nagar.For they were probably called Nagas after the serpent deities they worshipped;just like the worshippers of Vishnu,Shiva,Shakti,are even now called Vaishnavas,Shaivas and Shaktas.

The most plausible suggestion is that the Nagas were the aboriginal inhabitants of Kashmir before the advent of the Vedic Aryans.The latter fought with them and the Pishachas and pushed them to the south , east and west.However we need not go here into a detailed discussion about this tribe.Suffice it to say that Nagas were the first people to settle in the land broutht forth by the desiccation of the Satisaras and jealously guarded it from incursions of the the tribes from the north and the south.

axes ,including perforated ones and adzes,chisels,etc and (iii) handmade pottery of two varieties ,black and grey.

The Neolithic cultures of Central Asia consist of three main cultural complexes,viz(i) the Djeiitum culture,(ii) the Kiltminar culture and (iii) the Gissar culture.

The Djeitum culture with its distribution in south Turkmenia,is characterized by the use of (i) microlithic flint industry,(ii) bone sickle-handles,(iii) bone implements including needle,(iv) stone axes and querns,and (v) handmade pottery,occasionally painted in reddish brown on cream background.The Djeitum culture which is dated 6000 B.C.shows links with the early farming settlements of the Near East.

The Keltminar culture,with its distribution near the Aral Sea,is distinguished by the use of (i) chert microliths,(ii) bone implements,and (iii) handmade pottery, sometimes bearing incised and stamped decoration.It is dated about 3000 B.C.

The Gissar culture,with its distribution in different parts of Tadjikistan and Uzbekistan Republics is marked by the presence of (i) scapers of chopper-chopping variety,(ii) Microliths including blades and fluted cores,(iii) ground stone axes including the crescent shaped sickle,and (iv) bone implements.The culture is dated about 3000 B.C.

Most of the traits of the Burzuhom sequence, viz lunar knives,pit dwellings,perforated celts,are paralleled on sites in Central and Northern China.

It would be seen that the similarity between the assemblages of Northern Neolithic culture of India,exemplified by the Burzuhom sequence and the Neolithic culture in Central Asia-i.e.Central and north China as well as former Soviet Central Asia,would have resulted from the movement of people and culture into the sub-continent from the north,most probably through the passes connecting these areas.In studying the speed of Neolithic culture, the geographical and and ecological

isolation of Neolithic villages was thus broken and conditions were ripe for the movement of both ideas and people.

Fortunately some remarkable Neolithic and Chalcolithic sites have been excavated at several places in India.These have been designated as Southern,eastern and Northern Neolithic cultures.Of the three it is the Northern Neolithic culture exemplified by the sequence at Burzuhom near Srinagar in Kashmir which has a distinctive assemblage. This singles it out from the other two Neolithic cultures in India.

After a close study of the objects unearthed at Burzuhom,two phases of occupation have been recognized.In phase I,the beginning of which is dated to about 2300 B.C.,the material culture included (i) coarse grey or black burnished pottery,often with mat impressed bases;(ii) bone tools including awls,needles and harpoons;(iii)packed and ground stone axes;(iv)ring tools.The inhabitants lived in pits dug into the *karewa* soil.In phase II,which seems to have continued till about 1400 B.C.,the pit dwellings gave place to structures built on ground.

Other innovations included the introduction of the potter'swheel. Towards the end of the phase came the knowledge of metallurgy – a single arrowhead of copper and pierced rectangular or semi-lunar knives known as harvesters.To this phase also belong human and animal burials.The absence of stone blade industry throughout the two phases of occupation is significant.

Sinkiang and Cental Asia

Neolithic culture sites have been found in Sinkiang and Central Asia.Lou-lan,a site located on the international trade route in the tarim basin of Chinese Central Asia and a few other sites in the Lop Nor desert have yielded these cultures.

The characteristic traits of the assemblage include the presence of®I) blades,including fluted cores;(ii) ground stone

Himalayan foothills-the Shiwalk formations traversed by the Indus system from the Peshawar Valley in Pakistan to the Kangra valley in India.

Similarly excavations in Central Asia have revealed that the original habitat of the Old Stone Age man in that region was in the low ranges of the Pamirs, the Gissar, Babatag and Zarafshan traversed by the Amu and Syr rivers and their tributaries from southern Kazakhistan to Tadjikistan.

Geographically,the two areas arte contiguous,a factor that must have facilitated physical and cultural contacts of people in these regions.

Recent researches in both the areas have,in fact,thrown some welcome light in this direction.we are now in a position to visualize not only a parallel and similar development of the Old Stone Age culture in India and Central Asia but also their occasional contacts.What the nature of such contracts was can only emerge in coming years when more work is done. At present our analysis is based upon tool typology alone.

Neolithic Culture

With further human cultural development we find during the Neolithic and Chalcolithic periods a closer affinity between man living in the two regions.There is clear evidence to this effect available from excavations in Northern India and Central Asia.

The Neolithic period marks the appearance of a momentous change.During the period we find the emergence of effective village farming communities.Thre are distinct traits of food production,stock raising,grinding of tools and manufacture of pottery.

Later during the Chalcolithic period,wer find man engaged in trade following his acquistition of knowledge of metallurgy which entailed securing of raw materials, sale or barter of finished products or surplus food.The self-sufficiency and

Burzuhoma

The Neolithic culture is indicated by the discovery of ground and polished stone axes,hoes and pestles and bone implements,at the well known menhir site of Burzuhoma ten miles east of Srinagar.Burzuhoma is famous as one of the two megalithic sites in the extreme north-west of the Indian sub-continent.it has thrown considerable light on the pre and proto-historic periods in Kashmir.

The findings at this site unearthed by the Archaeological Survey of India who began excavations in 1960,will be discussed later.here it is important to mention that near about the silt bed,pits have been discovered in section,indicating a settlement of early pit-dwellers whose date has been tentatively fixed at 3000 B.C.This is perhaps the only known find of such settlement in India and indications are that more valuable date will be found when extensive surface diggings are taken up.

Who were these pit-dwellers using stone and bone tools?This is a question to which nobody has as yet hazarded an asnswer.Much more work is needed before firm conclusions can be reached as regards the date and the historical significance of these Neolithic and chalcolithic peoples;even so it will be of value to state the problems and indicate the general direction to which the evidence points.

Central Asian Evidence

Large-Scale investigations of archaeological sites in Central Asia and Northern India reveal a certain typographical affinity between their cultures going as far back as the Old Stone Age.The movement of ideas and peoples over Central Asia to Northern India and back can now be traced to Old Stone Age,and does not begin only from the second century B.C.Further, this was a continuous process seen through the major pre-and proto-historic periods.

The Sohan culture of Northern India has established that the original habitat of the Old Stone Age man in India was in the

existed for ages-tend in the direction of the Vale having been occupied by a lake,and these have usually been considered to corroborate the conclusions drawn from the observed phenomena.Agreeing as I do with the conclusion,I cannot count the traditions as perceptibley strengthening it;I have little doubt that they themselves originated in the same physical evidence that later travelers have examined.

The geological observations upon which modern scientific inquires have based their belief as to the former existence of a great lake,are the undoubted lacustrine deposits found in the Karewas or plateaus in the Valley.These deposits though of no remote date,speaking by a geological standard.are far older than any monuments of man that have yet been discovered.

Prehistoric

Whether man ever saw the lovely Satisaras,is not yet possible to say.Prehistoric explorations in the Valley have revealed the occurrence of the Quatemary Glacial Cycles.The lacustrine deposits called *karewas* are geological formations of the Ice Age.These overlay the terminal moraines of the first glaciation and are comprised of two groups,lower and upper,differentiated by the moraines of the second glaciation.The intervening moraines are geologically similar to the boulder conglomeration of Pothwar region,Distric Rawalpindi (Pakistan)which contain Pre-Sohan tools.The upper *Karewa* beds represent the second inter-glacial age and can be equated with similar deposits in the Sohan valley,which present pebble tools,the products of the early Sohan industry.No palaeolithic tool has , however, been found in the Valley so far,and human occupation in Pleistocene Kashmir is still to be proved.

The Mesolithic or the Proto-Neolithic period appears to be indicated by the findings of De Terra and paterson in the Jhelum Valley of Kshmir " of great numbers of artificially flaked stones among which were flaked cores reminiscent of palaeolithic technique,but in all these places it was certain that the flakes are associated with pottery-bearing layers of either Neolithic or historic date."

great distress to all neighbouring regions by his devastations.The Sage kashyapa,the father of all Nagas,while on his pilgrimage in the north of India,heard of the cause of this distress from his son, Nila, the king of the Kashmir Nagas.The sage,determined to punish the evil-doer,proceeded to Brahma to implore his and other gods'help for this purpose.His prayer was granted.All the gods by Brahma's command started for the Satisaras and took up their position on the lofty peaks above kaunsamag.the demon who was invincible in his own element,refused to come forth from the lake.Vishnu,thereupon,called upon his brother, Balabhadra,to drain the lake which he did by piercing the mountain with his ploughshare. When the lake had dried up,Jalodbhava was attacked by Vishnu and after a fierce combat slain with His war-disc.

Kashyapa then settled the land of Kashmir which had thus been produced. The gods took up their abode in it as well as the Nagas, while the various goddesses adorned the land in the shape of rivers. At first men dwelt in it for only six months in the year owing to a curse of Kashyapa who angered by the Nagas, had condemned them to dwell for the other six months with the Pishachas.The men thus left the valley for the six months of winter and returned in Chaitra (March-April) when Pishachas with drew.

Another version of the legend in Buddhistic form is alluded to by Heun Tsiang.Its main features,as related in the *Nilamatpurana*,live to this day in popular tradition.They are also reproduced in all Muhammadan abstracts of the *Rajatarangini*.From Malik Haider's *Twarikh*,the legend became known to Bemier and has since found its way into almost every account of Kashmir.

Geological Evidence

Drew recognized clearly the true relation between the legend and those physical facts which seem to support the belief that Kashmir was in comparatively late geological times wholly or in great part occupied by a vast lake. "The tradition",he says, "of the natives-traditions that can be historically traced as having

(APPENDIX)

Origin of the Land and People of Kashmir

P.N.K. Bamzai

A remarkable feature of the origin of the land and of the people of Kashmir is the legends in which they are woven. But what is more remarkable is that they stand the modern scientific tests converting the legends into historical facts. I wonder if such a phenomenon is portrayed in any other part of the world.

The Legend

The legends about the origin of the Valley are unanimous in referring to its having been a vast inland lake formed of the waters from the melting ice and snow on the high mountain peaks surrounding it. According to the *Nilamatpurana* which is the oldest record of the legend,the lake was called Satisara ,the lake of Sati.Geological evidence also corroborates the legend that the valley of Kashmir was originally-a lake hundreds of feet higher than the present valley bottom.The Gorge through which the River Jhelum escapes was then blocked up,and the whole Valley filled up with what must have been the most lovely lake in the world.

In the period of the seventh Manu:goes the legend, the demon Jalodbhava('water-born'),who resided in the lake,caused